ادبی کارنامے

ولف:- محمد صدیق ایم اے بی ٹی و سید ظہیر الدین علوی ایم اے

ادبی کارنامے

مؤلفہ

سید ظہیر الدین احمد علوی ایم اے (اردو) ایم اے (فارسی)
لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

و

محمد صدیق ایم اے بی ٹی (علیگ)
اسسٹنٹ ماسٹر آف لینگویج اسلامیہ انٹر کالج جونپور

پبلشر
مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ
۱۹۵۱ء

قیمت عہ/ ۱۲

مقدمہ

"ادبی کارنامے" دو حصوں پر مشتمل ہیں۔

مؤلفین نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایسے مضامین اور نظموں کا انتخاب ہو جو ظاہری دلچسپی کے علاوہ طلبہ کے لئے علمی حیثیت سے مفید بھی ہوں۔

اس امر کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ انتخاب کے ذریعہ قدیم شعرا کے ذہنی ارتقاء کا نقشہ سامنے آجائے اور جدید شعرا کے رجحانات کا بھی پتہ لگ سکے۔ چنانچہ دور قدیم اور دور جدید کے تمام مشہور مصنفین اور مستند شعرا کے انتخابات درج ہیں۔

انتخاب کی تازگی کا نفسیاتی اثر نہایت خوشگوار ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نفسیاتی اثر تعلیمی اور ادبی نقطۂ نظر سے نہایت مفید اور مستحسن ہوتا ہے۔

اس انتخاب میں شعرا اور مصنفین کے ایسے کلام اور مضامین درج ہیں جن سے اس کی خصوصیات علٰحدہ علٰحدہ سمجھ میں آسکیں۔

ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ طلبہ اور اساتذہ کریں گے۔

"مؤلفین"

فہرست

مرزا اسد اللہ خان غالب

اسد اللہ خاں نام، نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب اور مرزا نوشہ عرف تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ پھر غالب اختیار کیا۔ غالب کی پیدائش ۱۷۹۷ء میں بمقام آگرہ ہوئی۔ پانچ سال کے تھے کہ باپ کی وفات ہوگئی۔ لڑکپن ننھیال میں گزرا ۱۸۱۳ء یا ۱۸۱۴ء میں آگرہ چھوڑ کر دلی آگئے۔ ان کے چچا انگریزی فوج میں رسالدار تھے اُن کے انتقال کے بعد ورثا کے لئے سات سو روپیہ سالانہ مقرر ہوگئے تھے یہی آمدنی غالب کی معاش کا مستقبل سہارا تھی۔ اس کے علاوہ کچھ عرصہ کے لئے دربار اودھ سے پانسو روپیہ سال اور دربار دہلی سے پچاس روپیہ ماہوار پاتے رہے۔ غدر کے بعد یہ سب ذرائع مسدود ہوگئے۔ مگر اسی زمانہ میں رامپور سے سو روپیہ ماہوار ملنے لگے اور تین برس بعد سرکاری پنشن بھی جاری ہوگئی ۱۸۶۹ء میں ۷۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ عمر بھر تنگ دست اور پریشان حال رہے جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اُن کا طرز معاشرت امیرانہ تھا اور سخاوت فطرت ثانیہ۔ احباب کثرت سے رکھتے تھے اور حیثیت سے زیادہ دوسروں پر خرچ کر دیتے۔ سائل اُن کے در سے کبھی محروم واپس نہ جاتا۔ آم کباب اور شراب یہ تین چیزیں بہت پسند تھیں۔ مزاج میں بلا کی شوخی اور

ظرافت تھی، جو اُن کے کلام سے بھی ظاہر ہے۔ غالب کا مطالعہ وسیع تھا کتابیں خرید کر اور خرید نہ سکتے تو کرایہ پر منگا کر پڑھتے رہتے۔ شعرائے فارسی کے کلام پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ اور اپنے زمانہ کے کسی فارسی داں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اُن کے فارسی دیوان میں قصائد غزلیات، قطعات، مثنویاں، رباعیاں، غرض ہر صنفِ سخن کا نمونہ موجود ہے۔ اُن کو اپنے فارسی کلام پر بجا طور پر ناز تھا اور اُس کے مقابلہ میں اُردو کے مجموعہ کو حقیر سمجھتے تھے۔ غالب کو کیا خبر تھی کہ مرنے کے بعد اُن کو حیاتِ دوام اسی "بے رنگ" کلام اور ان ہی خطوط سے ملے گی جو اُن کے قلم سے اُردو زبان میں یادگار چھوڑے ہیں۔ اُردو نثر میں خطوط کے سوا غالب کی کوئی تصنیف نہیں۔ لیکن تنہا ان خطوط نے اُردو نثر میں غالب کو وہ مرتبہ دے دیا ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔ خطوط نویسی میں وہ اپنی طرز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اُن کی زبان سادہ روزمرہ ہے۔ رسمی القاب و آداب استعمال نہیں کرتے۔ کبھی بغیر القاب کے خط شروع کر دیتے ہیں اور کبھی ایسے ایسے القاب طبع زاد لکھتے ہیں کہ محبت اور یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ شوخی اور مزاح سے شاید ہی کوئی خط خالی ہو۔ راقم کا نام اور تاریخ تحریر بھی کبھی لکھتے ہیں اور کبھی نہیں۔ غرض ان جدتوں اور خوبیوں نے غالب کے مکاتیب کو افسانوں سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

خطوطِ غالب

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

کیوں صاحب مجھ سے کیوں خفا ہو آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بالمکند اس کا بیٹا یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں وہ آمد خطوط کی موقوف تم تین صاحبوں کے آنے کی توقع اس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں ایک تم ہو کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو سنو صاحب اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھا اگر کچھ کام آ پڑا دو خط تین خط ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیجدی بھائی صاحب کا بھی خط دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا اس کا جواب بھیجدیا گیا مولوی قمر الدین خاں یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں کس واسطے کہ مجھ کو مئی میں کہا کہ اوائل جون میں جاؤں گا بہر حال اگر آپ آزردہ نہیں تو جس دن

میرا خط پہنچے اس کے دوسرے دن اس کا جواب لکھئے! اپنی خیر و عافیت منشی صاحب کی خیر و عافیت مولوی صاحب کا احوال اس سے سوا گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا جو معلوم ہوا ہو وہ الفاظ مناسب میں ضرور لکھنا۔ راجہ جو وہاں آیا ہوا ہے اس کی حقیقت دھولپور کا رنگ صاحبان عالیشان کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے۔ آگرہ کا حال کیا ہے وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں۔

غالب نگاشتہ شنبہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

ایضاً

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ تم میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا "اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں" مرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھنا ؎

شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب　　اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمان من است

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے اس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ مفرط بطرف شعر و سخن تمہاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے، اور بھائی یہ جو تمہاری

سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے سو گاہ گاہ جب دل اُٹھنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔ ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست، اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میر مہدی مجروح کے نام

سید خدا کی پناہ عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے کہ تم نے سارے جہاں کو سر پر اٹھایا ہے ایک غریب سید مظلوم کے چہرہ نورانی پر دھبا سا نکلا ہے تم کو سرمایہ آرائش گفتار بہم پہنچا ہے میری اُن کو دعا پہنچادو اور اُن کی خیر و عافیت جلد لکھو۔ بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوئی تھی آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے آج ۲۷ مارچ کی ہے پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں آنچ ویسی ہی تیز ہے خدا اپنے بندوں پر رحم کرے مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے تم کو یاد ہو گا کہ ایک دستنبو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی وہی القاب قدیم کتاب کی تعریف عبارت کی تحسین مہربانی کے کلمات کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا پنشن کے ملنے کا بھی حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین صاحب کو دعا کہہ دینا اور یہ خط دکھا دینا۔

غالب

ایضاً

اے جناب میرن صاحب السلام علیکم حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے۔ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔ تو حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں بخار جاتا رہا ہے صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ۔ اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔

میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن کے
بعد آپ خط شوق سے لکھیئے گا۔ میاں بیٹھو۔ ہوش کی خبر لو۔ تمہارے
جانے نہ جانے سے کیا علاقہ۔ بوڑھا آدمی۔ بھولا آدمی تھا تمہاری
باتوں میں آگیا اور آج تک اس کو خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ۔
سنو میر مہدی صاحب میرا کچھ گناہ نہیں اپنے خط کا جواب لکھو تپ
تو رفع ہو گئی پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال
رکھا کرو۔ یہ بری بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمہارا
پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا۔ حالات یہاں
کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو بیٹھے ہیں
میں کیا جانوں حکیم اشرف ہیں اور ان میں کچھ کونسل ہو تو رہی ہے۔
پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان
سے یہ پوچھیو کہ جناب ملکہ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل
میں تمہاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کیجیو کہ یہ جو فارسی مثل
مشہور ہے کہ "دفتر را گاو خورد" اس کے معنی کیا ہیں۔ پوچھیو ورنہ
چھوڑیو جب تک نہ بتائیں۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینہ آیا
اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں سرنامہ لکھ کر چھوڑوں گا جب
ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔ میر سرفراز حسین
کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر
بن گئے کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں۔ میر

نصیر الدین کو دعا کہنا۔

یوسف مرزا صاحب کے نام

یوسف مرزا تجھ کو کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں نہ تڑپے گا۔ صلاح اس میں نہیں بتائی جاتی۔ دُعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا کہ یوسف مرزا کو' تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات اگر سچ ہے' تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا' نہ قید حیات رہی' نہ قید فرنگ۔

مرزا حاتم علی مہر کے نام

مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے آتنا تو لکھو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی۔ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا پورا بھجوایا ہاں مرزا تفتہ نے ہاتھرس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے اُن کو دے آیا ہوں اور اُنھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی الواح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر اب اُن دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی خبر کیا ہے اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے۔ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد مہنائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ جلدیں کب آئیں گی۔ ہرچند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور رہو۔ مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور رہو۔ خدا کرے اُن تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آجائیں تا خاص و عام جا بجا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا اُس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔ غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزلسرا نہ ہوا

چودھری عبدالغفور سرور کے نام

بندہ پرور بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامہ پر دستخط اور کسے اور نام آپ کا پایا دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا۔ خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمہارے دشمن بعارضۂ تپ ولرزہ رنجور ہیں اعاذاللہ ضعف کی شدت کہ خط لکھنے سے معذور ہیں خدا وہ دن دکھائے کہ تمہارا خط تمہارے دستخطی آئے سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو خط پڑھ کر دونی مسرت ہو جب تک ایسا خط نہ آئے گا دل سودازدہ آرام نہ پائے گا قاصد ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا جناب ایزدی میں سرگرم دعا رہونگا آپ کے عم عالی مقدار اور بزرگ آموزگار کو میرا اسلام مع صنوف اشتیاق والوف احترام جناب چودھری صاحب آؤ ہم تم حضرت صاحب عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں اُن کے کف پائے مبارک سے ملیں میں سلام کروں گا تم معروض ہونا کہ غالب یہی ہے اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے میں نے عزم قدمبوسی کیا پیرو مرشد نے مجھے گلے لگالیا فرماتے ہیں کہ غالب تو اچھا ہے عرض کرتا ہوں کہ الحمدللہ حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے ارشاد ہوا کہ مولوی سید برکات حسن تیری تعریف بہت کرتے رہتے ہیں جناب یہ ان کی خوبیاں ہیں ایسا نہیں ہوں۔ جیسا وہ کہتے ہیں کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے ضعف قویٰ واضمحلال کہتے

تاکہ میں اُن کے کلام کی تصدیق کرتا ان کی غمخواری اور دردمند نوازی کا دم بھرتا۔ **شعر**

در کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن
اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں حضرت سچ تو یوں ہی کہ غمہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا اتنا تنگ کر دیا ہی ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل میں کسی طرح تسلی نہ پائی اب دو باتیں سوچتا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا یہ صغریٰ اور کبریٰ دلنشیں ہے نتیجہ اُس کا تسکین ہے ہیہات۔ **شعر**

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

اجی حضرت شاہ عالم صاحب میرا سلام کہیئے کاغذ باقی نہیں رہا اپنے سب بھائیوں کو مع وزیر علی صاحب میرا سلام کہہ دیجئے۔

سرسید احمد خاں

ہندوستان کا یہ نامور فرزند ۱۸۱۷ء میں بمقام دہلی پیدا ہوا اسلاف عہد شاہجہانی سے دربار مغلیہ کے ساتھ منسلک رہے ہے۔ سرسید کے دادا سید ہادی کو جوادالدولہ کا خطاب تھا اور شاہ عالم بادشاہ دہلی کے عہد میں مختلف خدمات جلیلہ پر مامور رہتے تھے۔ دادا کے مرنے کے بعد وہی منصب اور خطاب اُن کے والد میر متقی کے لئے تجویز کیا گیا۔ لیکن میر متقی ایک آزاد منش آدمی تھے۔ منصب قبول نہ کیا ننھیال میں سید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر سب سے زیادہ باا قبال اور دانشمند تھے اور اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں وزیر سلطنت مقرر ہوئے۔ لیکن تمام خاندان میں اخلاق اور کردار کے اعتبار سے سب سے زیادہ ممتاز سرسید کی والدہ تھیں۔ سرسید کی آئندہ ترقیاں اسی بلند خیال بی بی کی رہین منت ہیں اُس کی تربیت نے سرسید کو سرسید بنا دیا۔ اس زمانہ کے مسلمانوں میں فارسی۔ عربی۔ منطق۔ فلسفہ۔ طب وغیرہ کی تعلیم کا رواج تھا۔ سرسید کو بھی یہی مروجہ تعلیم ملی۔ تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ سرکاری ملازمت قبول کر لی۔ پہلے سررشتہ دار پھر منصف پھر صدر امین اور آخر صدر الصدور اور خفیفہ جج ہوئے دوران ملازمت

میں تعلیم اور مطالعہ برابر جاری رہا۔ اسی زمانہ میں لندن کی سیاحت کو گئے، اور اسی زمانہ سے قومی خدمات انجام دینے لگے۔ سب سے پہلا ادارہ جو سرسید نے قائم کیا مراد آباد کا فارسی مدرسہ تھا۔ اس کے بعد غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی اس غرض سے بنائی کہ علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی جائیں۔ اسی سال غازی پور میں ایک انگریزی مدرسہ جاری کیا۔ تعلیمی خدمات کے سلسلہ کی آخری کڑی مدرسۃ العلوم علی گڑھ تھا جس کا سنگ بنیاد ۱۸۷۵ء میں رکھا گیا۔ لیکن مدرسۃ العلوم کی کامیابی بغیر اس کے ناممکن تھی کہ مسلمانوں میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کی جائے اور انگریزی تعلیم سے جو نفرت عام طور سے پھیلی ہوئی تھی اُس کو دور کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جس کا پہلا پرچہ دسمبر ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔ یوں تو سرسید کی انشا پردازی اور تصنیف و تالیف ایک عرصہ سے جاری تھی۔ اس سے پہلے ہی کم و بیش چھوٹی بڑی ۲۰ ۲۵ بیس پچیس کتابیں جن میں بعض بڑی تحقیق کثیر محنت اور انتہائی کاوش سے لکھی گئی تھیں شائع ہو چکی تھیں لیکن تہذیب الاخلاق نے سرسید کے اصلاحی خیالات اور مذہبی اعتقادات کو ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچا دیا اور اس کے علاوہ اردو صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ سرسید کے طرز تحریر کی نسبت کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں

مولانا حالی کی حیات جاوید سے جو اقتباس لیا گیا ہے۔ اُس سے اُن کی ادبی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا۔ بہر حال ایک مدبر، مصلح، یا محقق کی حیثیت سے سرسید کو بُرا کہہ لیجئے یا اچھا۔ لیکن ایک ادیب، انشا پرداز اور صحیفہ نگار کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اُن کی عظمت مُسلم ہے جس کے سامنے دوست دشمن سب خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

اُمیّد کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک اے آسمان کے تاروں تمہاری خوشنما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو، اے پہاڑ کے عالی شان درختو۔ اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دل کش نیل بوٹو تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو۔ اس لئے کہ ہم سے بہت دور رہو اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے۔ کیا عقل ہے جس کو سب۔ سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں

کیا وہ ہم کو آیندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے۔ جو سب کے سامنے ہے۔

او انورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید۔ یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہمارے مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لئے نام آوری نام آوری کے لئے۔ بہادری بہادری کے لئے فیاضی فیاضی کے لئے۔ محبت محبت کے لئے۔ نیکی نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی تو ہی نے اس ناامید کو ناامید نہ ہونے دیا۔ تو ہی نے اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس کو اس ذلت سے نکالا۔ اور پھر اس کو اسی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا جہاں

کہ فرشتوں نے اُسے سجدہ کیا تھا۔

اُس نیک نبی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مارپیٹ سہی۔ تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا جبکہ طوفان میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا تو تو ہی اُس طوفان میں اُس کی کشتی کھینے والی اور اُس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہر ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔

اے آسمانوں کی روشنی اور اے ناامید دلوں کی تسلی امید۔ تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈتا ہے وہاں کی ٹھنڈی ہوا خوش الحان جانوروں کے راگ بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے اُس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی

جاتی ہے ہاتھ کام میں اور دل بچہ میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے "سورہ میرے بچے سورہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور اے میرے دل کی ٹھنڈک سورہ اے میرے دل کی کونپل سورہ۔ بڑھ اور پھل پھول تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے۔ تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے۔ کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے۔ سورہ میرے بچے" سورہ۔ میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے" سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت تیری لیاقت تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا آخرکار ہمارے دل کو تسلی دیگی۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہوگی۔ تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی۔ تیری آواز ہمارے لئے خوش آیند راگنیاں ہونگی۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ اے ہماری امیدوں کے پودے سورہ۔ بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاویں گے تو تم کیا کروگے۔ تم ہماری بے جان لاشوں کے پاس کھڑے ہوگے تم پوچھوگے اور ہم کچھ نہ بولیں گے۔ تم روؤ گے اور ہم کچھ رحم نہ کریں گے۔ اے میرے پیارے رونے والے۔ تم ہمارے ڈھیر پر آگر ہماری روح کو خوش کروگے۔ آہ تم ہم کو ڈھونڈوگے اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤگے۔ اپنی ماں کا محبت بھرا چہرا اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کروگے۔ آہ ہم کو یہی رنج ہے کہ

اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہو گے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ سورہ میرے بالے سورہ"۔

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جبکہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہستی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اماں، اماں کہنا سیکھا اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اُس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کے بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل بے گناہ زبان اور بے ریا خیال سے خدا کا نام لینے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ اس لڑکے کے ماں باپ اس معصوم سینہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں۔ اے ہماری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا پیارا بیٹا بعیر دل کے ریوڑیں سے غائب ہو گیا ہے۔ وہ اُس کو ڈھونڈتا ہے پر وہ نہیں ملتا مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی۔ لہو بھرا دانتوں پیٹا کرتا دیکھتا ہے پر ملنے سے نا امید نہیں۔ فاقوں سے خشک

ہے غم سے زار نزار ہے۔ روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئیں ہیں۔ کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے مگر صرف ایک امید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھ وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات تہ خانوں میں بند ہے اس کا سورج سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے بے یار و دیار غیر قوم غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے قید خانہ کی مصیبت اس کی تنہائی اس گھر کا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ مگر اسے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید بھی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں مگر سب میں تقویت بھی تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ

بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو۔ او دلے بہادری کی ماں۔ تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے دن رات اپنے دل کو گلاتا ہے ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ ان کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے انھیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند عزیز اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں ؎

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں
بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں ہاں کر کے محبت اور دلسوزی سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں پر کوئی جی سے لگ کر دل

ہر وقت بے قرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا۔ کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بے قرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی طبیعت تو ہی ہردم ہمارے ساتھ ہے تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہی تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے۔ تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچیں گے۔ تیرے ہی سبب گوہر مراد کو پائیں گے اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے تھدی کی پیاری "اُمید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی۔ رنگ فق ہوجاتا ہے منہ پر مردنی چھاتی ہے ہوا ہوا ہیں۔ پانی پانی میں مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔

اس وقت اس زرد چہرہ اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی آنکھوں کی غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لئے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہوجاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی امیدِ تمام

دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے۔ گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے۔

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچی۔ تیری راہ تیری چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی اور موت کی سواری سے مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام "امید" ہے۔

گزرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ وہ یاد آتا ہے اُتنا ہی زیادہ غم بڑھتا ہے ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بہے چلے جاتے ہیں۔ پچھلا زمانہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اُس کو یاد آتا ہے۔ جبکہ اُس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیے اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی۔ آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لیے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اُس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا وائے وقت! ہائے وقت! ہائے گزرے ہوئے زمانے!! افسوس! کہ

ہیں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سُرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، اُمنگ میں بھرا ہوا دل، جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی تھی اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ "آہ! ابھی بہت وقت ہے"۔ بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اُس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا! آہ وقت گزر گیا۔ آہ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ "ابھی وقت بہت ہے"۔

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹٹول ٹٹول کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے بجلی کی کڑک سے دل بیٹھا جاتا ہے ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اُڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا "ہائے! ہائے! میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات"۔ یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن دوست آشنا یاد

آئے۔ جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے یہ کہتی ہوئی کہ "ہائے بیٹا! وقت گزر گیا۔" باپ کا نورانی چہرہ اُس کے سامنے ہے اور اُس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ "کیوں بیٹا! ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے؟ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے خاموش ہیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

ایسی حالت میں اس کو وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اُس پر اُن کی گلی ہوئی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اُس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹا جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا "ہائے وقت نکل گیا! ہائے وقت نکل گیا! اب کیونکر اس کا بدلہ ہو۔"

وہ گھبرا کر پھر گھڑی کی طرف دوڑا۔ اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی کی طرف پہنچا۔ اُس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اُس کی گھبراہٹ کچھ

کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑپن یاد آیا، جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن، نہ وہ دل رہا تھا نہ دل کے ولولوں کا جوش اُس نے اپنی نیکی کے زمانہ کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اور اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجد اور کنوئیں بنوانا یاد کرکے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا ابھی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی اس کی آواز نہیں سنتا۔ اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل بہت گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا؟ جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا "ہائے وقت! ہائے وقت!! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اُس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے، آندھی تھم گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں، اُن کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ دل بہلانے کے لئے

تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اُس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اُس میں خوبصورت دُلہن نظر آئی۔ اُس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں اُسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے بہت پاس آگئی اور یہ اُس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہوگیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے اس سے پوچھا کہ "تم کون ہو؟" وہ بولی کہ "میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔" اُس نے پوچھا کہ "تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے؟" وہ بولی "ہاں ہے نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کا فرض ادا کرکے انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری میں سعی کرے اُس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔" دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا۔ پس بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے۔ انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔" یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہوگئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اُس نے

اپنی بچپن کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ خاص انسانی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دُلہن کے ملنے سے مایوس ہوا اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آیندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بیقرار ہو کر چلا اٹھا۔ "ہائے وقت! ہائے وقت!! کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں۔ ہائے میں دس ہزار دینار دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا" یہ کہہ کر اُس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اُس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اُس کی پیاری ماں اُس کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اُس کو گلے لگا کر اُس کی بلائیں لیں۔ اُس کا باپ اُس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اُس کے گرد آ کر کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ "بیٹا کیوں برس برس کے دن روتا ہے؟ کیوں تو بیقرار ہے؟ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟" اُٹھ منہ ہاتھ دھو کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں" تب وہ لڑکا جاگ اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا اُس نے سُن کر

جواب دیا کہ "بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا اُس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔"

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ اوہ ! یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے میں کبھی اُس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اُس دلہن کو بیاہوں گا جس نے اپنا خوبصورت چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتایا۔ او خدا ! او خدایا تو میری مدد کر۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہموطنو ! اور اے پیارے بچو ! انسانی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ اخیر وقت میں اُس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور انسانی ہمدردی اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔

مولوی نذیر احمد

مولوی نذیر احمد صاحب ضلع بجنور کے رہنے والے تھے ۔ ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے ۔ ننھیال ددھیال دونوں طرف اہل علم و فضل موجود تھے ۔ کچھ عرصہ تک والد بزرگوار سے پڑھتے رہے ۔ پھر دہلی بھیجدیئے گئے دہلی کے دوران قیام ہی میں دہلی کالج میں داخل ہو گئے ۔ کالج میں آٹھ سال پڑھنے کے بعد پہلے مدرس ہوئے اور دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے ۔ غدر کے زمانہ میں انھوں نے ایک میم کی جان بچائی اس خیر خواہی کے صلہ میں ہنگامہ ختم ہونے کے بعد الہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری عنایت ہوئی ۔ اسی زمانہ میں قانون تعزیرات ہند کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کے صلہ میں تحصیلداری کے عہدہ پر فائز ہوئے دو سال بعد ڈپٹی کلکٹر بنا دیئے گئے اس کے بعد حیدرآباد بلالئے گئے جہاں ترقی کرتے کرتے ریونیو منسٹر ہو گئے ۔ مگر جب سر سالار جنگ کا انتقال ہو گیا جو مولوی نذیر احمد کے سچے قدردان اور مربی تھے تو پنشن لیکر دہلی چلے آئے اور باقی عمر تصنیف و تالیف کے محبوب مشغلہ میں گزاری حکومت نے مولانا کی بے نظیر قابلیت کا اعتراف کیا اور ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب عنایت فرمایا ۔ ترجمہ قرآن کی اشاعت کے بعد اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری پیش

کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈی ۔ ایل کا اعزاز ملا ۔ ۱۹۱۲ء میں موت نے اُن کی طویل ادبی اور علمی زندگی کا خاتمہ کر دیا اردو ادب پر ڈاکٹر نذیر احمد کا احسان کبھی فراموش نہیں ہو سکتا ۔ یہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے دور از قیاس افسانوں کے بجائے اصلی واقعات اور واقعی زندگی کو قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا اور ناول نگاری کی بنیاد رکھی ۔ نذیر احمد پہلے شخص ہیں ۔ جنھوں نے نسوانی مذاق کی کتابیں لکھیں ورنہ اس سے پہلے اردو میں یہ صنعت مفقود تھی ۔ مولانا کی تحریر میں روزمرہ محاورے جس صحت، صفائی، اور دلکشی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اُس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی ۔ لطف زبان میں اُن کا مقابل کوئی ہے تو آزاد ۔ لیکن آزاد نے عبارت کو اس رنگ سے آراستہ کیا ہے جیسے کوئی مشاطہ دلہن کو سنوارتی ہے ۔ اور نذیر احمد نے زبان کو کچھ اس طرح نکھارا ہے کہ بغیر ہی کسی زیور کے دلفریب معلوم ہوتی ہے ۔

آزاد کی طرح وہ بھی ایک ہی رنگ میں لکھتے تھے چاہے موضوع کچھ ہو ۔ مگر جس رنگ میں لکھتے تھے وہ اپنی جگہ اس قدر دلفریب تھا کہ انشا پردازی کو شاعری بنا دیتے تھے ۔ مولانا کے تمام افسانوں میں ایک اصلاحی پہلو ہر جگہ نظر آئے گا ۔ مگر توبۃ النصوح میں یہ شان خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے ۔

کلیم کا گھر سے بھاگنا

اب ہم کو کلیم اور نعیمہ دونوں بھائی بہنوں کا حال بیان کرنا چاہیئے کہ باپ سے کے گھر سے نکل کر اُن پر کیا بیتی؟ سو چونکہ کلیم پہلے نکلا۔ پہلے اسی کا حال بیان کرتے ہیں۔ کئی بار اُس کو باپ نے بلوایا۔ یہاں تک کہ ہار کر رقعہ لکھا۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا۔ بھائی نے بہت کچھ کہا سُنا لیکن وہی روبراہ نہ ہوا اور جب دیکھا کہ فہمیدہ صالحہ کے اتروانے میں مصروف ہے، آنکھ بچا بے پوچھے بے کہے گھر سے اس طرح نکل کھڑا ہوا کہ گویا اُس کو کچھ تعلق ہی نہ تھا۔ شاید اُس کے ذہن میں بھی یہ بات اُس وقت نہ گزری ہوگی کہ وہ عمر بھر کے واسطے گھر سے جاتا ہے اور عزیز و اقارب جن سے وہ ایسے سرسری طور پر جدا ہوتا ہے جیتے جی اُن کو نہ دیکھ سکے گا۔ یہ نکلنا کچھ اُس کا نیا نکلنا نہ تھا بلکہ معمولی عادت اور ہمیشہ کی خصلت تھی۔ گھر سے نکل جانے کی اُس نے یہاں تک مشق بہم پہنچائی تھی کہ ذرا ذرا سی ادعائی ناخوشی پر وہ سے دن بھاگا کرتا تھا۔ مگر ادھر اُس کا نکلنا معلوم ہوا اور اُدھر نوکروں کے جاسوس اُس کی جستجو میں دوڑنے شروع ہوئے۔ شروع شروع میں تو نوکروں ہی کے بلانے سے چلا آتا تھا۔ پھر چندے یہ معمول رہا کہ اب خود میاں نصوح جاتے تو صاحبزادہ بلند اقبال کو

منالاتے اب تھوڑے دنوں سے نصوح کے عمل میں بھی تاثیر گھٹ گئی تھی تو بی فہمیدہ کی ڈولی دربدر ماری پھرا کرتی تھی اس دفعہ بھی وہ ضرور یہ توقع جی میں لیکر نکلا کہ گلی سے نکلتے نکلتے نوکر اس کے پیچھے دوڑیں گے اور اس امید میں اس نے اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے گھر پہنچتے پہنچتے کوئی سینکڑوں ہی مرتبہ پیچھے پھر پھر کر دیکھا مگر واقع میں یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ اب کلیم کے سوائے بقول نعیمہ گھر کا باوا آدم بدلا ہوا تھا۔ نہ پہلی سی ماں، نہ اگلا سا باپ۔ نوکر ڈھونڈیں کیوں؟ اور دوڑیں کس لئے؟ پھر بھی کلیم اس سے بے خبر نہ تھا کہ اس مرتبہ ایک خاص طرح کا بگاڑ ہے۔ وہ جانتا تھا کہ دینداری کا نیا چرچہ گھر میں ہو رہا ہے۔ خلاف توقع نعیمہ ایک تھپڑ کھا چکی ہے۔ سلیم اور حمیدہ جو گھر میں چھوٹے ہونے کی وجہ سے کلیم اور نعیمہ کے تختہ مشق تھے اب سب سے زیادہ باپ اور ماں دونوں کے چہیتے ہو رہے ہیں۔ یعنی جن کی بڑی لمبی چوڑی عزت تھی وہ ذلیل ہیں اور جو بے وقعت تھے ان کا طوطی بول رہا ہے۔

پہلے جب کبھی کلیم گھر سے ناخوش ہو کر نکلا تو کھانے کپڑے روپے پیسے کے لین دین پر۔ ماں یا بھائی بہنوں سے لڑائی جھگڑے کے سبب لیکن اس دفعہ دین کی بحث تھی، نہ لین دین کی۔ باپ سے لڑائی تھی نہ بھائی بہنوں سے۔ ذرا سی عقل معاملہ فہم بھی اگر کلیم کو ہوتی تو وہ ایسی حالت میں گھر سے نکلنے پر دلیری نہ کرتا۔ لیکن جیسا کہ نصوح نے

تجویز کیا تھا اُس پر شاعری کی پھٹکار تھی اور سر پر شامت اعمال سوار۔ اور واقع میں جب انسان شبانہ روز داد تحسین کی فکر میں منہمک ہے گا تو ضرور ہے کہ خود پسندی۔ خود بینی۔ خود ستائی کے عیوب اُس کی طبیعت میں راسخ ہوں۔

شعر وسخن کے اعتبار سے ہم بھی کلیم کو شاباش دیتے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ معاملہ اچھا باندھتا ہے۔ تضمین میں گرہ خوب لگاتا ہے بندش بھی خاصی ہوتی ہے۔ قصیدہ بھی بُرا نہیں کہتا طبیعت مضمون آفرینی پر بھی مائل ہے۔ مثنوی تو خیر مگر رباعی اُس کی لاجواب ہوتی ہے۔ مقطع میں تخلص کا نباہ یا تو متاخرین میں مومن مرحوم میں دکھایا اب ماشاءاللہ میاں کلیم ہیں صنائع لفظی کے اتنے التزام پر بے ساختگی اور قابل آفریں ہے اب قصیدے کی تشبیب بعد چندے سودا کے لگ بھگ ہونے والی ہے۔ چشم بد دور چھ سات برس کی مشق میں دو دیوانوں کا مرتب ہو جانا کچھ تھوڑی بات نہیں۔ شہر میں بھلا کچھ نہیں تو سو دو سو غزلیں لوگوں کے زبان زد ہوں گی سچ ہے۔ "بقول سخن خدا داد بات ہے"

الغرض شاعری میں کلیم کی لن ترانیاں چنداں بیجا نہ تھیں لیکن دنیا کے معاملات میں اُسکو غور وخوض کرنے کی عادت نہ تھی اسی وجہ سے اُس کی رائے برسر غلط ہوتی تھی۔ وہ گھر سے نکل کر ایسا بے تکلف مرزا ظاہر دار بیگ کی طرف کو مڑا جیسے مطلق العنان گھوڑا تھان کی طرف

رخ کرتا ہے۔ مرزا کی ظاہرداری نے اُس کو اس قدر دھوکا دے رکھا تھا کہ وہ اُن کو ماں باپ بھائی بہن۔ خویش و اقارب سب سے بڑھ کر اپنا خیر خواہ۔ سب سے زیادہ اپنا دوست سمجھتا تھا اور بے امتحان، بے آزمایش اُس کو مرزا پر ایسا تکیہ و اعتماد تھا کہ اتنا شاید دانشمند آدمی کو متواتر تجربوں کے بعد بھی کسی دوست پر نہیں ہو سکتا بات اصل یہ ہے کہ مردم شناسی کی جو ایک صفت ہے کلیم میں مطلق نہ تھی۔ مرزا سے زیادہ اس کو اپنی نسبت مغالطہ تھا اور اُس نے اپنے تئیں ایسا عزیز الوجود فرض کر رکھا تھا کہ ایک سے ایک لائق نوکری کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی اور کلیم کے ذہن میں از خود یہ خناس سمایا ہوا تھا کہ گویا تمام ہندوستانی سرکاریں اُس کے قدوم میمنت لزوم کی متمنی اور منتظر ہیں۔ اور جس طرف کو چل کھڑا ہوگا وہاں کا والی ملک اُس کی تشریف آوری کو بس غنیمت سمجھے گا۔ گھر سے نکلا تو محض تہیدست لیکن اس خیال میں مگن کہ اب کوئی دم جاتا ہے مالک خزائن الارض بننے والا ہوں۔ چلا جوتیاں چٹخاتا ہوا۔ مگر اس تصور میں مست کہ فیل کوہ پیکر مع ہودج زر اُس کی سواری کے لئے آرہا ہے باوجودیکہ شبخوابی کے کپڑوں کے سوائے بدن پر کچھ نہ تھا۔ تاہم خلعت ہفت پارچہ کی امید میں سے

نظر اُس کی نخوت کے زینہ پر تھی
کہ شانوں سے اُتری تو سینہ پہ تھی

قصہ کوتاہ کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمّے بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازہ پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اِس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اُس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اُس کا نانا وہ بھی حقیقی نہیں۔ ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اوّل تو ایسی عالیجاہ سرکار دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی اُس پر خود اُس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اُن کا شمار دلّی کے رودارؤں میں ہوگیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہوگئی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دُور کی قرابت تھی حسبتہً لِلّٰہ اس کا تکفل اپنے ذمہ لیا۔ جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اُس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اُس کے بیٹے، پوتے، نواسے کثرت سے تھے انھوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے مگر اُن کے ورثا نے بہزار دقت محلسرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ اُن کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینہ کے کرایہ کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں۔ مرزا کی بیوی۔ تین تین آدمی اور سات روپیہ کی کل کائنات، سو اُس پر مرزا کی شیخی اور نمود

یہ مسخرا اس ہستی پر جاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کو صد ہا روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔

اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھستا تھا۔ کسی کو بھائی جان، کسی کو ماموں جان، کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتہ ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اُس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی اختیار کر رکھی تھیں مگر زادگی بیچے تو کیسے بیچے۔ دکانیں گردی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بیچاری بہتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا۔ مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی۔ سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے۔ اوپر تنزیب یا ہلکی تن زیب نیچے کوئی طرحدار ساڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر بانات ڈیڑھ گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام۔ اور تیسرے پہر کا شافی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سُرخ نیفہ۔ پائجامہ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا۔ ریشمی ازاربند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اُس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی

سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا اگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محلسرا کو مرزا کی محلسرا اور جمعدار کے دیوان خانہ کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محلسرا ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں؟ اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیجدو۔

لونڈی۔ کون مرزا؟

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے۔ اور کون مرزا!

لونڈی۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے کہ کلیم نے کہا کہ

"کیوں جی! کیا یہ جمعدار صاحب کی محلسرا نہیں ہے"؟

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں؟

کلیم۔ پھر تم نے یہ کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے؟

دوسری لونڈی۔ اری کمبخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا۔ جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دبلا ڈیل اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم۔ ہاں ہاں! وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی۔ تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اُس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے "آہا۔ آپ ہیں۔ معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمراہ سیلے چلوں"۔

کلیم۔ چلئے گا کہاں؟ میں آپ کے پاس تک آیا تھا۔
مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں۔
کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے ہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔
مرزا۔ بسم اللہ! تو چلئے اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی مسجد ضرار کی طرح ویران۔ وحشت ناک نہ کوئی حافظ ہے نہ ملاّ۔ نہ طالب علم نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ اُن کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود گھر نجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و نا چار اُسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو اُن کو غشی میں پایا اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے تو یہ فرمایئے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟
کلیم نے باپ کی طلب اپنا انکار۔ بھائی کی التجا۔ ماں کا اصرار۔

تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو؟

مرزا۔ خیر نیت شب حرام "صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمائیے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں وہ وہی محلسرائیں متعدد دیوان خانے کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹڑے اور گنج اور دُکانیں اور سرائیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہو گی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو۔ یا یہ حال ہے کہ ایک تنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے اُن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندہ کو جمعدار صاحب

مرحوم مغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر دیے تھے شہر کے کل روسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دور بھاگتا ہے صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اُسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے۔ اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندہ کو منا لے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا؟

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت وحمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اجازت دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم۔ خیر۔ مقام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا میں نے لمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں گے تو کہہ دوں گا مرزا کو ہرچند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا کیونکہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑکر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اُس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یار۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا۔ سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو؟

کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے؟ دکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر

سمجھ میں آتی ہے کہ چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں - بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہوگی - رات کا وقت ہے - ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے - یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگ گئے اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے -

مرزا - یار ہو تو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا - ذرا واللہ ہاتھ تو لگا دو دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندی سوندی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا - تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا - کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے - دیکھئے اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے - بندہ نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دکان کا چبینا لا ناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے بھئی تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں - ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور؟ اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے کوئی پستئی، غرض دونوں رنگ خوشنمائیوں تو صدہا قسم کے غلے اور

پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن پچنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظرافت کی حکایت سنی ہے؟

کلیم۔ فرمائیے۔

مرزا۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو رزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جہاں میں نے سر زمین سے نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشو و نما کے ساتھ میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کوپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بار ور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکری بن کر لاکھوں من بونٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ و برگ بھس بنکر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اُس کو چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں۔ گھنگھنیاں پکائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بلبلانا تھا کہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرین دربار بے قدر خوش ہوئے کہ ہر شخص اُسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ ماجرا دیکھ کر بے انتہا حکم اخیر رخصت ہوا۔

سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز

بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ ہم نہیں پہنچ سکتا ورنہ میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھاپن کہاں؟ غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی اُس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزہ دار معلوم ہوئے۔

مرزا نے گھر جا کر ایک نیلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہونا عبرت کا مقام ہے یا تو خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال تھوڑا سا ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے نہ چراغ نہ چارپائی نہ بہن نہ بھائی نہ مونس نہ غمخوار نہ نوکر نہ خدمتگار۔ مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغ نوگرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اُسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور ہی بہت سے مضمون سوجھنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں کہی۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلّے کا کوئی اور عیّار ٹوپی۔ جوتی۔ رومال۔ چھڑی۔ تکیہ۔ دری۔ یعنی جو چیز کلیم کے بدن

سے متفک اور اُس کے جسم سے جدا تھی لیکر چلیت ہوا۔ یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کے اُٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پہ پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں ہو گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں مسجد تھی ویران اُس میں پانی کہاں، صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آنکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں اس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جوہیں زینے پر چڑھا کہ کلیم اُس سے عرض کرنے کے لئے لپکا وہ لڑکا اُس کی ہئیت کذائی دیکھ کر ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اُس نے اُس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا کلیم نے بہتیرا پکارا اُس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کرے ممکن ہو تو منہ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا کیوں حضرات آپ مجھ سے بھی واقف ہیں۔ اندر سے

آواز آئی۔ ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔ گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمہارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

تکیہ اور دری کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں تامل تھا کہ اندر سے آواز آئی، مرزا زبردست بیگ! دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے دوڑ کر تکیہ دری تو اس سے لو۔

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے چور چور کر کے جالیا۔ ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کئے مگر زبردست کا ڈھینگا سر پر اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔ کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا اور کلیم سے اس کا حسب و نسب پوچھا۔ ہر چند کلیم اپنا پتہ بتانے میں جھینپتا تھا مگر چار و ناچار اس کو بتانا پڑا۔ لیکن اس کی حالت ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ اس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو میں اُن کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے کہ اُن کے بڑے بیٹے کا بھی یہی نام ہے جو تم نے اپنا بیان کیا محلے کا پتہ گھر

کا نشان بھی جو تم نے کہا سب ٹھیک مگر کلیم تو ایک مشہور معروف آدمی ہے۔ آج شہر میں اُس کی شاعری کی دھوم ہے۔ تمہاری یہ حیثیت کہ ننگے سر ننگے پاؤں بدن پر کیچڑ بھی ہوئی مجھ کو باور نہیں ہوتا اچھا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے جرم سنگین ہے ان کو حوالات میں رکھو۔ صبح ہو ئیں اُن کے والد کو بلواؤں تو اُن کے بیان کی تصدیق ہو۔

کلیم یہ سن کر رو دیا اور کہا کہ میں وہی بدنصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سنا ہے اور آپ کو یقین نہ ہو تو میں اپنے افکار تازہ آپ کو سناؤں۔ چنانچہ کل شب کو جو کچھ مسجد و مرزا کی شان میں کہا تھا سنایا۔ اُس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ گئے اور اُن کو حکم دیا کہ ان کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ اُن کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا ورنہ واپس لاکر حوالات میں قید رکھنا۔

مولوی محمد حسین آزاد

آزاد مولوی محمد باقر کے بیٹے غالباً ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمد باقر استاد ذوق کے گہرے دوست تھے۔ اسی تعلق کی بنا پر آزاد نے ذوق کا تلمذ اختیار کیا۔ دہلی میں جب غدر شروع ہوا تو آزاد کے والد گرفتار اور بعدہٗ قتل کر دئے گئے۔ اس سانحہ کا آزاد کے دل و دماغ پر بڑا اثر پڑا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد آزاد دہلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے۔ مگر معاش کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر ۱۸۶۴ء میں لاہور پہونچے اور سر رشتہ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ اس زمانہ میں لاہور سے ایک سرکاری اخبار شائع ہوتا تھا جس کے اڈیٹر ماسٹر پیارے لال آشوب تھے آشوب اور آزاد دہلی کالج میں زمانہ طالب علمی ساتھ رہ چکے تھے۔ آشوب کی وساطت سے آزاد کی ملاقات ڈائرکٹر صاحب سر رشتہ تعلیم سے ہوئی۔ اور سرکاری اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر ہو گئے۔ ۱۸۶۵ء میں آزاد نے سرکاری سفارت پر کابل اور بخارا کا سفر کیا۔ دو مرتبہ ایران کی بھی سیاحت کی۔ ایک عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی اور عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۸۸۹ء میں جنون کا مرض لاحق ہوا۔ زندگی کے باقی بیس برس اسی مرض میں مبتلا رہے۔ پنجاب میں جس انوکھی شاعری کی بنیاد آزاد نے ڈالی تھی وہ اردو ادب میں ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ منظر کشی۔ واقعہ نگاری اردو ادب میں اسی زمانہ سے شروع

ہوئی لیکن آزاد شاعر کی حیثیت سے ناکام رہے۔ البتہ نثر میں ایک ایسی طرز کے مالک تھے کہ اس کو نہ کسی اور نے اختیار کیا اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔ نثر تصانیف میں آزاد کے تین شاہکار بہت مشہور ہیں۔ آبحیات، نیرنگ خیال اور دربار اکبری آزاد کی تمام تصانیف ایک ہی رنگ کی عبارت میں لکھی گئی ہیں۔ وہ رنگ کیا ہے۔ یہ بتانا کچھ آسان نہیں۔ الفاظ رنگین ہیں فقرے برجستہ کہیں کہیں مقفیٰ ہیں استعارے کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اور ایک خاص جادو جس میں ان کو بڑی مہارت ہے یہ ہے کہ ذہنی تصورات پیکر محسوس بن کر ان کے اشاروں پر کٹ پتلی کی طرح کھیلتے ہیں یہ صنعت جس کو انگریزی میں پرسانی فکیشن کہتے ہیں اُردو کے کسی ادیب نے اتنی کثرت یا اتنی کامیابی کے ساتھ نہیں برتی۔ اس انداز تحریر کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ گذرے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے یوں آتے ہیں جیسے سینما کے پردے پر چلتی پھرتی اور بولتی ہوئی تصویریں قدرتی طور پر آزاد کا رنگ ٹھوس علمی اور خشک تحقیقی مسائل کو بیان کرنے کے لئے ناموزوں تھا چنانچہ دربار اکبری جو ایک تاریخی تصنیف ہے۔ ان کے قلم سے نکل کر ناول بن گئی۔ آزاد میں یہ بھی کمزوری تھی کہ جذبات کی رو میں صداقت سے چشم پوشی کر جاتے تھے۔ جس کو محبوب رکھتے تھے اس میں کوئی عیب نظر نہ آتا تھا اور جس کو ناپسند کرتے تھے اس میں کوئی خوبی نہ دیکھ سکتے تھے۔ آبحیات میں اُستاذ ذوق کا حال تعریف بیجا اور دربار اکبری میں ملا عبدالقادر کا ذکر ہجو ناروا کی مثال ہے۔

سیرِ زندگی

ایک حکیم کا قول ہے کہ زندگی ایک میلہ ہے۔ اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گذرتی ہیں۔ یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے۔ اور پھر پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے جب اس فقرہ پر غور کی۔ اور آدمی کی اولتی بدلتی حالت کا تصور کیا تو مجھے انواع و اقسام کے خیال گذرے۔ اوّل تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حالتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنیٰ ادنیٰ چیز کا محتاج ہے۔ پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹنا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلبگار ہوتا ہے۔ ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے اُس کا عاشق زار ہوتا ہے۔

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتاً درد و مصیبت کی فریاد۔ خوشی کے ولولے۔ ڈر کی چیخیں۔ ہواؤں کے زور۔ پانی کے شور۔ ایسے اُٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا۔

اوّل تو دل بہت حیران ہوا۔ بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے

ہوئے تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں اور اس غل کا کیا سبب ہے۔ ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب جاتے کہاں ہو۔ دریائے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی کہ جس میں کچھ کشتیوں کی کمزوری سے کچھ ملاحوں کی غفلت سے کچھ ان کی بے وقوفی سے لاکھوں بھائی بند غارت ہوگئے۔ وہ نہر تو ہم اتر آئے ہیں۔ اب مانجھ دھار سمندر ہے اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے، کبھی گرداب ہے کبھی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کئے ہیں۔ جو رستے بتانے اور پار اُتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے ہیں۔ مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے نہ ملاح کی فقط خدا کی آس ہے اور بس ؎

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

یہ سُن کر میں نے غور سے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا اور دل نے کہا کہ پہلے ذرا نظر اٹھا کر تو دیکھ اور دیکھا تو فی الحقیقت ایک نہر خوشنما گلزار کے بیچوں بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے اس کی لہروں میں ظاہرا نہ کچھ زور تھا نہ شور تھا۔ مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا وہ اسے بلبلے کی طرح بہائے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا ہو تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں

سے شروع ہوتا ہے یعنی جس نے آنکھ کھولی تھی۔ اپنے تئیں باغ ہی میں
دیکھا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ اپنی لہر میں
بہتا چلا جاتا تھا اور دھند اتنی چھائی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر بھی کام نہ
کرتی تھی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں
ہیں اور جا بجا گرداب پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں
میں یا دھرادھر کے مزے لیتے جاتے تھے اور جو بیچارے پیچھے رہ گئے
تھے ان پر قہقہے اڑاتے جاتے تھے مگر یہ بھی ہنستے ہنستے انھیں گردابوں
میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا یہ غضب
تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی مشکل سے سنبھل سکتا تھا انھیں میں ایسے
لوگ بھی تھے کہ ناواقفیت اور نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں
کو گردابوں میں ڈال دیتے تھے اور موجوں کے تھپیڑے انھیں چٹانوں
پر ٹکر ٹکر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا اور کشتی کو
اس کی ٹکر پر چڑھا لانے کا تو کیا ذکر ہے اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ
کر بھی دھارے کے سامنے سے چڑھ آئے۔ کاش کہ جہاں سے چلا تھا پھر
وہیں آجائے۔ سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھام سے سنبھالے
چلے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ
خطرہ نہیں۔ اگر ہے تو اور ہم سفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے
تھے اور اپنی بدانجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اسی مصیبت میں مبتلا تھے
اور اپنا خیال نہ کرتے تھے جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بداعمالی

جو پرسے پر ملائے برابر عالم ہوا میں اُڑتی چلی جاتی تھیں۔ وہ لوگوں کو بھلا لیتی تھیں۔ ہر شخص خوش ہوتا تھا۔ اور دل میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا تھا کہ الحمدللہ میری کشتی کو کچھ خطر نہیں ہے۔ جو گرداب اوروں کو نگل گیا میں اس سے بچ جاؤں گا۔ اور جن چٹانوں نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا۔ انھیں بھی بے لاگ پھاند جاؤں گا غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے مگر انہی رستے چلے جاتے تھے اُس پر بے پرواہی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے تو چپو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہوکر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے۔

یہ سستی اور بے پروائی ان کی کچھ اس لئے نہ تھی کہ ایسی زندگی سے سیر ہو گئے تھے۔ کیونکہ جب ڈوبنے لگتے تھے تو سب چلاتے تھے۔ داد بیداد کرتے تھے اور اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا کوئی آؤ اور ہمیں سنبھالو۔ اور اکثر اخیر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حماقتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے تم بچے رہنا۔ چنانچہ ان کی ہمدردی اور محبت پرستی پر بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے نہ ان کی نصیحت پر کوئی اور عمل کرتا تھا۔ ادھر اُدھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ بہت سے مسافروں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ بہتیرے نیم جاں۔ بہتیرے ایسی بے کسی اور تکلیف

سے کچھ پیچھے ڈوبو گے۔ اور یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدہ پر راضی تھے۔ درحقیقت اُمید کی باتیں ان سے مسخراپن کے طور پر تھیں کیونکہ جتنی ان کی کشتیاں پرانی ہوتی جاتی تھیں اتنی ہی بے خبری کے عہد نامے تازے کرتی تھی۔ اور تعجب یہ ہے کہ جنھیں ڈوبنے کا یقین تھا۔ وہی کاروبار کے لئے زیادہ کمر کستے تھے۔

دریائے زندگی میں ایک بہت خوش نما جزیرہ نظر آیا۔ اس کے کنارے پر دریا سے لگا ہوا ایک بلند مینارہ تھا اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا یدا عنداالیوں کا گلزار جہاں تک جزیرہ کی حد تھی وہاں تک پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبت ناک گرداب پڑتے تھے یہاں کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور جتنی کھلی تھیں۔ نہایت سرسبز اور خوش نما تھیں۔ جوانانِ مرغزار یعنی ہرے بھرے درخت ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے جھوم رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں وہیں آرام اپنی پلنگڑی بچھائے لیٹا تھا۔ اور خوشی میٹھے میٹھے سروں میں پڑی ایک ترانہ لہرا رہی تھی۔ یہی مقام رہگذر عام کا تھا۔ اس لئے جو لوگ ادھر سے گذرتے تھے۔ یہاں کی سرسبزی ان کی آنکھوں کو ضرور طراوت دیتی تھی۔

ادراک کا ناخدا۔ داہنے ہاتھ پہ دوربین لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اسی سکڑے راستہ سے نکال لے جاتا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی کھینے کے لئے ان سے ڈانڈ مانگتا تھا کہ صحیح سلامت یہاں سے نکال دے۔ یہ

کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک دوسرے کو ان کی مصیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا۔ مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا جس کشتی پر ہم سوار تھے۔ حق یہ ہے کہ اس کے جوڑ بند بھی دریائے حیات کی موجوں کے صدمے اُٹھانے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ رستے میں ہی ٹوٹتے نظر آتے تھے۔ اور سب ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پھرتی کریں یا زور لگائیں ڈوبنے سے بچتے نہیں۔

جب ان آفتوں کا باہم چرچا ہوا تو جو مستِ غفلت زندگی کے نشہ سے سرخوش بیٹھے تھے وہ بھی غمگین ہو گئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے اور بزدلوں نامردوں کو زندگی عذابِ موت ہو گئی۔ بلکہ رنج و غم کے بعد جن جن راحتوں کی اُمید ہوتی ہے اس سے بالکل مایوس ہو گئے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطرہ تھا وہی زیادہ تر بے پرواہ تھے بلکہ سب کا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطرہ کا خیال دور ہی دور رہے اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئیں گی جو اُٹھائی نہ جائیں گی۔ وہ سامنے نگاہ بھر کے بھی نہ دیکھتے تھے۔ اس وقت کے لئے کچھ نہ کچھ مشغلے نکال لیتے تھے اُمید تو ہمیشہ اس رستہ میں ساتھ ہی رہتی تھی اس سے ہنس کھیل کر دل بہلاتے رہتے تھے۔

جن لوگوں کی امید سے بہت راہ تھی۔ اُن سے اس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کئے ہوئے تھے۔ مگر اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی جس کے سہارے سے بھاگ کر تو بچ جاتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اور دل

اس باغ سبز پر ایسے محو ہو رہے تھے کہ جواب بھی نہ دیتے تھے۔ خواہ خفا ہو کر کہیے۔ خواہ منتوں سے مانگیے۔ تھوڑے ہی ہوں گے جو اس کا کہنا بھی مانتے ہوں گے اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی دل خوش کر لیں اور عہد لے لو کہ پھر رستے بھر ہم کہیں نہ اٹکیں گے نہ سمجھتے تھے کہ تیرنا تو درکنار ان بلاؤں کے پاس کو نکلنا بھی غضب ہے۔ چھوا اور موا۔

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک جابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہو گیا اور جزیرۂ مذکور کی طرف لے چلا۔ اس جزیرہ نے کشتی کو اس طرح کھینچا جیسے مقناطیس سوئی کو کھینچے۔ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچھتائے اور جتنا زور تھا سب لگا دیا لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلا۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ہاں جن لوگوں پر ادراک جابکدست کی چالاک تدبیر کارگر ہوئی وہ بچے۔ مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے۔ اور نکلے تو جس طرح پہلے جاتے تھے اسی طرح پھر موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے طلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی۔ اور یہ بھی بادِ مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لئے جاتے تھے۔ آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے۔ اُدھر کشتی حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے۔ مگر جو ڈوبتا تھا اپنی کوتاہ اندیشی پر بہت پچھتاتا تھا اور اوروں کو نصیحت کرتا جاتا تھا کہ ع

من نہ کردم شما حذر بکنید

خبردار کوئی جزیرۂ بداعتدالی کے سامنے نہ آنا۔

خدا کی قدرت کہ جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے ان کے کاریگر بھی وہیں موجود تھے۔ بہت لوگوں کو اپنے کاریگروں پر بڑا بھروسہ تھا اور بعض کشتیاں بھی ایسی تھیں کہ انھیں تھوڑا ہی صدمہ پہنچا تھا مگر معلوم ہوا کہ جنھوں نے تھوڑا صدمہ اٹھایا تھا وہ بھی کچھ بہت نہ جیئے۔ روز بروز مرض بڑھتا گیا۔ آخر ڈوب ہی گئے۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ بعض ضرب رسیدہ ایسے تھے کہ کاریگروں نے خود ان کی مدد سے پہلو بچایا مگر بہتیرے کاری گر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا تھے۔

غرض سیر زندگی میں چالاک لوگوں نے بھی اگر پایا تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ پیچھے ڈوبے وہ پہلے ڈوبے۔ بہتیرے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہمراہیوں کے ساتھ چلے آتے تھے انھیں غوطے کھاتے دیکھتے چلے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے یعنی باد مخالف برابر غرق کئے جاتی تھی۔ نہ ان بیچاروں کو محنت تدبیر کرنی پڑتی تھی۔ نہ غم انتظار اُٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی ٹکر کھا کر بچ نکلے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے بہت کچھ لڑے مگر جو اوروں پر پہلے گزری تھی وہ ان پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا تو یہی ہوا کہ اُمید کو بھی کنارۂ کامیابی تک پہنچنا محال ہے۔ یہ حالات دیکھ کر

میرا دل ایسا زندگی سے بیزار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کرکے اس دریا میں کود پڑوں۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت سبز لباس پہنے سامنے کھڑا ہے اور اپنے عصا سے اشارہ کرکے پاس بلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر پھیرا اور عصا اُٹھا کر سامنے اشارہ کیا۔ خدا جانے دوربین الٰہی سے میری آنکھیں روشن کر دیں یا کہر جو دھواں دھار ہو رہی تھی اسے اپنی برکت سے اُڑا دیا۔ دیکھوں تو سبحان اللہ صبح سعادت کا وقت ہے۔ چمن کے لہلہے مرغان سحر کے چہچہے پھولوں پر شبنم۔ صبا اور نسیم کھم کھم جزیرے کے جزیرے میووں سے چھوٹتے اور پھولوں سے لہلہاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جگمگ جگمگ لہریں مار رہا ہے۔ بڑے بڑے امرا شرفا خلعت ہائے فاخرہ اور زرق برق لباس پہنے پھولوں کے طرّے سر پر ہار گلے میں ڈالے ادھر اُدھر درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں۔ کچھ فواروں کے نیچے حوض میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ کچھ پھولوں کی کیاریوں میں بے تکلف لوٹتے ہیں اور گانا سن رہے ہیں۔ غرض کہ ہجوم بہار اور رسیلی آوازوں کے ستاروں نے وہ جمگھٹ کر رکھا تھا کہ شور قیامت بھی آئے تو خبر نہ ہو۔ اس عالم کو دیکھ کر میرا ساغر دل خوشی سے چھلک گیا اور بے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آجائیں تو اڑوں اور اس باغ فرح بخش میں جا پڑوں لیکن اس پیر بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں۔ اِلّا دروازہ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو دیکھو وہ سرسبز اور رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے

ہیں اور سمندر کی قالین پر گل کاری کر رہے ہیں حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمہاری نظر کام کر سکے بلکہ جہاں تک تمہارا خیال دوڑ سکے۔ اس سے بھی آگے تک لا انتہا چلے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحبدلوں کے گھر یہیں ہوں گے۔ جن جن لذتوں کو جی چاہیے اور طبیعت کیفیت اُٹھائے سب یہاں موجود ہیں۔ ہر جزیرۂ باغ جنت کا مکان ہے کہ اپنے اپنے مکیں کے لائق شان ہے۔ کیوں آزاد کیا یہ مقام اس لایق نہیں کہ جان تک بھی ہو تو دیجیے اور انھیں لیجیے کیا اس زندگانی کو مصیبت سمجھنا چاہیئے۔ جس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں؟ کیا موت سے ڈرنا چاہیئے؟ کیا ملک عدم کو خوش ہو کر نہ چلنا چاہیئے؟ جس کی بدولت ایسی نعمتیں حاصل ہوں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں اور سنتے ہو! نہ سمجھنا کہ انسان جس کے لئے یہ بے زوال سامان ہیں اسے یوں ہی پیدا کر دیا ہے۔ دنیا مقام امتحان ہے۔ ہم تم جہاں امتحان دینے آئے ہیں۔ امتحان کا نام سنتے ہی میں چونک پڑا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی

خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ بہن بھائیوں کی سرپرستی میں تعلیم کچھ ادھوری سی ہوئی ۱۷ سترہ سال کے تھے کہ شادی کردی گئی۔ لیکن ذاتی شوق اور مطالعہ سے درسی تعلیم کا نقصان پورا کرتے رہے۔ خانگی حالات سے مجبور ہو کر ملازمت اختیار کی لیکن اسی زمانہ میں غدر شروع ہو گیا۔ خواجہ صاحب پانی پت آگئے اور کئی سال بیکار بیٹھے کتابوں سے دل بہلاتے رہے۔ حسن اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ تعلقہ دار جہانگیر آباد سے شناسائی ہو گئی آٹھ برس بہ طرز مصاحب ان کے ساتھ رہے شیفتہ مرحوم فارسی میں بھی شعر لکھتے تھے اور اردو میں بھی۔ غالب سے مشورہ لیتے تھے۔ شیفتہ کے ساتھ حالؔی بھی اپنا کلام اُستاد غالب کی خدمت میں بھیجنے لگے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی کو پنجاب بک ڈپو میں ایک نوکری مل گئی اسی زمانہ میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم پنجاب اور مولانا محمد حسین آزاد نے ایک مشاعرہ قائم کیا جس میں طرح کے بجائے نظم کے لئے ایک

عنوان مقرر کیا جاتا تھا۔ حالی نے ان مشاعروں میں بڑی
سرگرمی سے حصہ لیا اور چار مشہور مثنویاں یعنی برکھارت، رحم
والانصاف، امید اور حُبِ وطن اسی سلسلہ میں لکھی گئیں ۱۸۷۹ء
میں حالی کا معرکۃ آلارا مسدس شائع ہوا جس نے ہر کس و ناکس
سے خراج تحسین وصول کیا۔ لاہور کی ملازمت سے دستکش
ہوئے تو اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس ہو گئے۔ دہلی کے
دوران قیام میں حیاتِ سعدی اور مقدمہ شعر و شاعری کی اشاعت
سے حالی کی شہرت عام اور مسلم ہو گئی۔ ریاست حیدرآباد نے
بصیغہ امداد مصنفین، پچھتر روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر فرمایا جو
چار سال بعد سو روپیہ کر دیا گیا۔ اسی وقت سے حالی نے
ملازمت سے کنارہ کشی کر لی۔ اس کے بعد یادگار غالب اور
حیاتِ جاوید لکھی۔ یہ دونوں کتابیں حالی کا بڑا کارنامہ سمجھی
جاتی ہیں حالی پہلے شاعر تھے جس نے گل و بلبل کو چھوڑ کر، مناظر
فطرت اور اصلاح ملت کو شعر و سخن کا موضوع قرار دیا اسی
طرح وہ پہلے مصنف تھے جس نے اردو میں سیر و سوانح لکھے
اُن کا انداز تحریر سرسید سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ اُن کی زبان
میں بھی تصنع اور تکلف کو دخل نہیں۔ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی
کی قدیم روش کو وہ بھی ناپسند کرتے تھے مگر سرسید کا جوش و
خروش اُن کی تحریر میں مفقود ہے۔ البتہ اُن کی زبان سرسید

کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اور رواں ہے، اُن کی عبارت
تاثیر سے خالی نہیں ہوتی، مگر یہ تاثیر اُن کی قوت استدلال
اور سلاست زبان کا نتیجہ ہے نثر و نظم دونوں میں حالی کی
ایک خصوصیت ہندی الفاظ کا استعمال ہے جن کو وہ اس
خوبصورتی سے لکھ جاتے ہیں کہ بیگانے نہیں معلوم ہوتے۔ اسی
طرح انگریزی الفاظ کو بھی وہ ہر قدم پر لبیک کہتے ہیں مگر یہ
پیوند آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔

غالب کے لطیفے

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور اُن کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ اُن کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت، مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حُسن بیان، حاضر جوابی، اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ۔ ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

لطیفہ۔ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہونچے تو وہاں نواب صاحب ان کے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا "کہ آب چشمۂ حیواں درون تاریک است" جب دیوان خانے میں پہونچے تو اس کے دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔

مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا "ایں خانہ تمام آفتاب است"۔
لطیفہ - ایک صحبت میں مرزا، میر تقی کی تعریف کر رہے تھے شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے - انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی - مرزا نے کہا "میں تو تم کو میر ہی سمجھتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں"۔
لطیفہ - مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے، وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا، اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھڑی تنگ و تاریک تھی، جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کے جانا پڑتا تھا، اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے - ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے - مولانا بھی وہیں پہونچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا، مرزا نے کہا "قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے یہی کوٹھری تو ہے"۔
الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و

ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

خود داری - باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا مگر خود داری اور حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراو عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے۔ وہ بھی کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے' میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا' نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آئے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟ مرزا نے کہا مجھ کو ان کا ایک آنہ دینا تھا' اس لئے اوّل وہاں گیا تھا' وہاں سے یہاں آیا ہوں۔

لطیفہ - ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم۔ چمٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ "کہ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔"

جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہونچا تو وہ نہایت شرمندہ ہوئے' اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

خوراک۔ مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے، یہاں تک کہ مسہل کے دن انھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا اخیر میں ان کی خوراک بہت کم ہوگئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرہ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لئے گھر میں آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں لعاب یا شوربا، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی، ایک اور پیالی میں دو تین پیسے بھر دہی اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب، بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

لطیفہ۔ ایک روز دوپہر کا کھانا آیا، اور دسترخوان بچھا، برتن تو بہت سے تھے۔ مگر کھانا نہایت قلیل تھا مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔"

آموں کی رغبت۔ فواکہ میں آم ان کو نہایت مرغوب تھا آموں کی فصل میں ان کے دوست دور دور سے ان کے لئے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے، اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کر کے آم منگواتے تھے۔

لطیفہ۔ ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے، باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے

تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدے ہوئے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا، مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟"

مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے "بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں ÷ کاین فلاں ابن فلاں ابن فلاں ÷ اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔

بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

لطیفہ۔ حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے اُن کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گذرا آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا "بیشک گدھا نہیں کھاتا۔"

لطیفہ۔ مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفتہً بھیجتے تھے۔ خود بازار سے منگواتے تھے۔ باہر سے دُور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان

کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

ناؤ نوش۔ مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں تھیں اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے، اور نشہ کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت برا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیرخواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے۔ جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوی اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کا نشے کی عادت نے آخرکار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا، جس کی شکایت سے ان کے تمام اردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

لطیفہ۔ مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی۔ اکثر شام کو ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے، اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے، اور مرزا پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟ انھوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجیئے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ جب وہ پیر داب چکے انھوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمھارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا۔"

لطیفہ۔ ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور ان کے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔" پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ "نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لئے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے، مگر خاص ان کے لئے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز ان کے لئے مزعفر پکا تھا، وہی ان کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا جو اس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے

اس کو کھانا دینے کے لئے خالی رکابی طلب کی۔ اس کے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا "حضور اور رکابی کیا کیجیے گا اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے" نواب یہ فقرہ سن کر بھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی۔

لطیفہ۔ ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؛ نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے' نہ بیل ہے' نہ بوٹا ہے' مگر بادشاہ خود مختار ہے' کوئی دم نہیں مار سکتا"۔

لطیفہ۔ ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انھوں نے کہا "قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؛ میرا اپنا جوتا آپ پہن لیتا" مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا' بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں"۔

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے انھوں نے شراب کی جا بجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اس کو بہت بُرا جانتے تھے اور اپنے اس فعل پر سخت

نادم تھے۔ باوجود اس کے انھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں۔ شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔

لطیفہ۔ ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا "بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیے جس کے لئے دعا مانگے"۔

لطیفہ۔ ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں ؎

بے مے نہ کند در کفِ من خامہ روائی
سرد است ہوا آتش بے دود کجائی

میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب ہائے غضب۔

نیچرل شاعری

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو نیچرل شاعری کا لفظ اکثر لوگوں کی زبان پر جاری ہے اس کی کسی قدر شرح کی جائے۔ بعض حضرات! نیچرل شاعری اس شاعری کو سمجھتے ہیں جو نیچریوں سے منسوب ہو، یا جس میں نیچریوں کے مذہبی خیالات کا بیان ہو۔ بعضے یہ خیال کرتے ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جس میں خاص مسلمانوں کی یا مطلقاً کسی قوم کی ترقی یا تنزل کا ذکر کیا جائے مگر نیچرل شاعری سے یہ دونوں معنی کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔

نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے، جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو، جس میں وہ شعر کہا گیا ہے کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں، پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر ان نیچرل سمجھا جائے گا۔ یعنی نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ

ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا وہ ان نیچرل سمجھا جائے گا۔ مثلاً

"کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب"

ان دونوں شعروں کو نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ بیان بھی بول چال کے موافق ہے اور مضمون بھی اچھا ہے کہ جس موقع پر وہ لایا گیا ہے، وہاں ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے یا مثلاً

"رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح"

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت انسان اپنے دل سے اسی طرح مشورہ کیا کرتا ہے یا مثلاً

ترے رخسار و گیسو سے بتا تشبیہ دوں کیونکر
نہ ہی لالہ میں رنگ ایسا نہ ہی سنبل میں بو ایسی

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ اور کوئی بو معشوق کے رنگ و بو سے بہتر یا اس کے برابر نہیں معلوم ہوتی۔ یا مثلاً

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا۔ کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھ جاتا ہے اس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ شعر بھی نیچرل ہے اور فطرت انسانی کی کسی قدر گہری اور پوشیدہ خاصیت کا پتا دیتا ہے، جس کے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے، ایسے ہیں جن کو لفظاً اور معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچرل کہنا چاہیے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے ہیں جن کو لفظاً یا معنیً یا دونوں حیثیتوں سے نیچرل نہیں مانا جا سکتا۔ مثلاً

کبھی ہے دھیان عارض کا کبھی یاد مژہ دل کو
کبھی ہیں خار پہلو میں کبھی گلزار پہلو میں

اس شعر کو صرف لفظاً نیچرل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن معنیً نہیں کہا جا سکتا معشوق کے تصور سے بلاشبہ عاشق کو فرحت بھی ہو سکتی ہے اور رنج بھی۔ لیکن جب فرحت ہو تو عارض اور مژگاں دونوں کے تصور سے فرحت ہونی چاہیے اور جب رنج ہو تو دونوں کے تصور سے رنج ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پلکیں جو خار سے مشابہ ہیں اُن کے تصور سے پہلو میں خار ہوں اور عارض جو گل سے مشابہ ہے۔ اُس کے تصور سے پہلو میں گلزار ہو۔ یا مثلاً

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

جوہر اندیشہ میں کیسی ہی گرمی ہو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس میں صحرانوردی

کا خیال آنے سے خود صحرا جل اُٹھے۔ یا مثلاً

کیا نزاکت کہ جو توڑا شاخ گل سے کوئی پھول
آتشِ گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں

نزاکت کسی درجے کی کیوں نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ آتش گل یعنی خود گل کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں۔ مثلاً

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری
بجنبشتر ہوتا تھا پیدا واں شجر کافور کا

سرد مہری میں اتنی ہی ٹھنڈک ہو سکتی ہے جتنی کہ لفظ سرد دیتا۔ پھر اس کے کشتہ کی خاک میں اتنا اثر ہوتا کہ اس سے شجر کافور پیدا ہو محض الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ جن میں معنی کا بالکل نام و نشان نہیں۔

ہر زبان میں نیچرل شاعری ہمیشہ قدما کے حصے میں رہی ہے مگر قدما کے اول طبقہ میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ انھیں کا دوسرا طبقہ اس کو سڈول بناتا ہے اور سانچے میں ڈھال کر اس کو خوشنما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے مگر اس کی نیچرل حالت کو اس خوشنما اور دلربائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ ان کے بعد متاخرین کا دور شروع ہوتا ہے اگر یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہیں رکھتے اور خیالات کے اسی دائرے میں محدود رہتے ہیں جو قدما نے ظاہر کئے تھے اور نیچر کے اس منظر سے جو قدما کے پیش نظر تھا آنکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھتے تو ان کی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل حالت سے تنزل کرتی ہی یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہ راست سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اس

کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم کچے اور الوہنے ماش یا مونگ، پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے۔ انھیں پانی میں اُبال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اسی کو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر اور مناسب مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی کے پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنی چاہتا ہے، اس کے سوا اور کوئی موقع تنوع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے۔

اسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دل نشین کرنے میں کوشش کرتے ہیں، فرض کرو کہ فارسی زبان میں، جس پر اردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے، جن لوگوں نے اول غزل لکھی ہوگی ضرور ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کے اسباب اور دواعی محض نیچرل اور سیدھے سادھے طور پر معشوق کی صورت، حسن و جمال، نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو قرار دیا ہوگا۔ ان کے بعد لوگوں نے انھیں باتوں کو مجازاً اور استعارہ کے پیرایہ میں بیان کیا، مثلاً نگاہ و ابرو و غمزہ و ناز و ادا کو مجازاً تیغ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا اور اس جدت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف و بامزہ ہو گیا۔ متاخرین جب اسی مضمون پر پل پڑے اور ان کو قدما کے استعارہ سے بہتر کوئی اور استعارہ ہاتھ نہ آیا اور جدت پیدا کرنے کا خیال دامنگیر ہوا،

انھوں نے تیغ و شمشیر کے مجازی معنی سے قطع نظر کی اور اس سے خاص سرد ہی یا اصیل تلوار مراد لینے لگے جو قبضہ، باڑ، پھیلا، آب اور تاب اور ڈاب سب کچھ رکھتی ہے۔ میان میں رہتی ہے، گلے میں حمائل کی جاتی ہے، زخمی کرتی ہے، ٹکڑے اڑاتی ہے، سر اتارتی ہے، خون بہاتی ہے، چوزنگ کاٹتی ہے، اس کی دھار تیز بھی ہو سکتی ہے اور کُند بھی، قاتل کا ہاتھ اس کے مارنے سے تھک سکتا ہے، وہ قاتل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر سکتی ہے، اس کے مقتول کا مقدمہ عدالت میں دائر ہو سکتا ہے، اس کا قصاص لیا جا سکتا ہے، اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جا سکتا ہے۔ غرض کہ جو خواص ایک لوہے کی اصلی تلوار میں ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے لئے ثابت کرنے لگے یا مثلاً اگلوں نے کسی پر عاشق ہو جانے کو مجازاً دل دادن یا دل باختن یا دل فروختن سے تعبیر کیا تھا۔ رفتہ رفتہ متاخرین نے دل کو ایک ایسی چیز قرار دے لیا ہے جو کہ مثل ایک جواہر یا ایک پھل کے ہاتھ سے چھینا جا سکتا ہے، واپس لیا جا سکتا ہے، کھویا اور پایا جا سکتا ہے، کبھی اس کی قیمت پر تکرار ہوتی ہے، سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے ورنہ نہیں دیا جاتا، کبھی اس کو معشوق عاشق سے لے کر کسی طاق میں ڈال کر بھول جاتا ہے، اتفاقاً وہ عاشق کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور وہ آنکھ بچا کر وہاں سے اڑا لاتا ہے، پھر معشوق کے ہاں اس کی ڈھنڈیا پڑتی ہے اور عاشق اس کی رسید نہیں دیتا۔ کبھی وہ بازو کے جیسے میں آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ سارا گھر چھان

مارتے ہیں کہیں پتا نہیں لگتا۔ اتفاقاً معشوق جو بالوں میں کنگھی کرتا ہے تو وہ جوں کی طرح جھڑ پڑتا ہے۔ کبھی وہ ایسا تلپٹ ہو جاتا ہے کہ زلفِ یار کی ایک ایک شکن اور ایک ایک لٹ میں اس کی تلاش کی جاتی ہے مگر کہیں کچھ سراغ نہیں ملتا۔ کبھی وہ بیع بالخیار کے قاعدے سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے کہ پسند آئے تو رکھنا ورنہ پھیر دینا اور کبھی اس کا نیلام بول دیا جاتا ہے کہ جو زیادہ دام لگائے وہی لے جائے۔

یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اس لئے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے مجازاً صیاد باندھا تھا۔ پچھلوں نے رفتہ رفتہ اس پر تمام احکام حقیقی صیاد کے مترتب کر دیئے۔ اب وہ کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے۔ کہیں اس کو تیر مار کر گراتا ہے۔ کہیں ان کو زندہ پنجرے میں بند کرتا ہے۔ کہیں ان کے پر نوچتا ہے۔ کہیں ان کو ذبح کرکے زمین پر تڑپاتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر و کمان لگا کر جنگل کی طرف جا نکلتا ہے۔ تمام جنگل کے پنچھی اور پکھیرو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ سینکڑوں پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا بیسیوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں اور لوؤں اور بٹیروں کے اس کے دروازے پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے چڑیمار اس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشقِ الٰہی یا محبتِ روحانی کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہو سکتی ہے، مجازاً شراب کے نشہ سے تعبیر کیا تھا اور مناسبت سے جام و صراحی، خم و پیمانہ اور ساقی و مے فروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کئے تھے۔ یا بعض شعرائے متصوفین نے

شراب کو اس وجہ سے کہ وہ اس دارالغرور کے تعلقات سے تھوڑی دیر کو فارغ البال کرنے والی ہے بطور تفاؤل کے موصل الی المطلوب قرار دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اور اس کے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشاعرہ بلامبالغہ کلال کی دکان بن گئی۔ ایک کہتا ہے لا۔ دوسرا کہتا ہے اور لا۔ تیسرا کہتا ہے کہ پیالہ نہیں تو اوک ہی سے پلا۔ کچھ بہک رہے ہیں اور کچھ بہکار رہے ہیں۔ کوئی وعظ پر پھبتی کہتا ہے کوئی زاہد کی داڑھی پر ہاتھ لپکاتا ہے۔ کوئی شیخ کی پگڑی اچھالتا ہے۔ جوان اور بوڑھے، جاہل اور عالم، رند اور پارسا سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، جو ہے سو نشہ کے خمار میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جدھر دیکھو العطش العطش کی پکار ہے۔

یا مثلاً قدما نے لاغری بدن کو اندوہ عشق یا صدمۂ جدائی کا ایک لازمی نتیجہ سمجھ کر اس کو کسی موثر طریقے سے بیان کیا تھا۔ متاخرین نے رفتہ رفتہ اس کی نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ فراش جھاڑو دیتا ہے۔ تو خس وخاشاک کے ساتھ عاشق زار کو بھی سمیٹ لے جاتا ہے۔ معشوق جب صبح کو اٹھتا ہے تو عاشق کو لاغری کے سبب بستر پر نہیں پاتا۔ لاچار بچھونا جھاڑ کر دیکھتا ہے تاکہ زمین پر کچھ گرتا ہوا معلوم ہو، عاشق کو موت ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ مگر لاغری کے سبب وہ اس کو کہیں نظر نہیں آتا۔ میدانِ قیامت میں فرشتے چاروں طرف ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور قاضی یوم الحساب منتظر بیٹھا ہے مگر عاشق کا لاغری کے سبب کہیں پتہ نہیں ملتا۔

اسی طرح متاخرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچرل طور پر باندھ گئے تھے نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہونچا دیا۔ معشوق کے دہانہ کو تنگ کرتے کرتے صفحۂ روزگار سے اُس کا قلم مٹا دیا۔ کمر کو پتلی کرتے کرتے بالکل معدوم کر دیا۔ زلف کو دراز کرتے کرتے عمر خضر سے بھی بڑھا دیا۔ رشک کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بدگمان بن گئے۔ جدائی کی رات کو طول دیتے دیتے ابد سے جا بھڑایا۔ الغرض جب پچھلے انھیں مضامین کو جو اگلے باندھ گئے ہیں اوڑھنا اور بچھونا بنا لیتے ہیں تو ان کو مجبوراً نیچرل شاعری سے دست بردار ہونا اور میل کا بیل بنانا پڑتا ہے۔

اس بات کے زیادہ ذہن نشین کرنے کے لئے (کہ شاعری کا آغاز کس حالت میں ہوتا ہے۔ اور پھر قدما کا دوسرا طبقہ اس کو کس طرح اسی نیچرل حالت میں درست کرتا ہے اور اُن کے بعد متاخرین اس کو کیا چیز بنا دیتے ہیں) اُردو شعرا کے ہر ہر طبقہ کے کلام میں سے کچھ کچھ مثالیں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی مثال۔ شاہ آبرو جو اُردو شعرا کے سب سے پہلے طبقے میں شمار ہوتے ہیں وہ اس کیفیت کو جو معشوق کے دیکھنے سے عاشق کے دل میں پیدا ہوتی ہے اسی طرح بیان کرتے ہیں۔

نین سے نین جب ملائے گیا ۔۔۔ دل کے اندر مرے سمائے گیا
تجھ گرم نین مرے دل میں ۔۔۔ خوشی میں آگ سی لگائے گیا

[illegible]

کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اُسے کس حال میں دیکھا

میر تقی جو مرزا رفیع کے معاصر ہیں وہ اسی کیفیت کو یوں ادا کرتے ہیں۔

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آوے

خواجہ حیدر علی آتش، جن کو چوتھے یا پانچویں طبقہ میں سمجھا گیا ہے، وہ اسی کیفیت کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

تختۂ نرد عشق دل کھیلا جو حسنِ یار سے
چھٹ گئے ایسے مرے چھکے کہ ششدر ہو گیا

دوسری مثال۔ شاہ ابرو اُس طول مدت کو جو مفارقت کے زمانے میں عاشق کو محسوس ہوتا ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گذری سو جگ بیتا

اسی مضمون کو میر نے یوں ادا کیا ہے۔

ہر آن ہم کو تجھ بن اک اک برس ہوئی ہے
کیا آ گیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ

ناسخ جو پانچویں طبقہ میں ہیں وہ اس مضمون کو یوں باندھتے ہیں۔

جائے کافور سحر چاہیے کافور حنوط   یہ شب ہجر ہے یارو شب دیجور نہیں

یعنی شب ہجر جب تک ہماری جان نہ لے گی ٹلنے والی نہیں ہے۔ پس کافور سحر کی توقع رکھنی عبث ہے بلکہ اس کی جگہ کافور حنوط غسل میت کے لئے درکار ہے اگرچہ مضمون کے لحاظ سے تینوں شعروں کو نیچرل کہا جا سکتا ہے کیونکہ شوق و انتظار کی حالت میں ممکن ہے کہ عاشق کو ایک گھڑی جگ اور ایک ایک آن برس کے برابر معلوم ہو اور ممکن ہے کہ عاشق طول شب فراق سے تنگ آکر جینے سے مایوس ہو جائے۔ مگر ناسخ کی طرز بیان اُردو کی معمولی بول چال سے اس قدر بعید ہے کہ اس کو کسی طرح نیچرل بیان نہیں کیا جا سکتا۔

تیسری مثال۔ شاہ حاتم جو پہلے طبقہ میں شمار کئے گئے ہیں دوست کے ملنے کی آرزو اس کے دیکھنے کے شوق کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

زندگی درد سر ہوئی حاتم کب ملے گا مجھے پیا میرا

سودا یوں کہتے ہیں۔

دل کو یہ آرزو ہے صبا کوئے یار میں ہمراہ تیرے ہوجئے مُشتِ غبار میں

منشی امیر احمد صاحب امیر جو موجودہ طبقے کے مشہور شاعر ہیں وہ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

واکردہ چشم دل صفت نقش پا ہوں میں
ہر رہ گزر میں راہ تری دیکھتا ہوں میں

اس مثال میں بھی تینوں شعروں کو اگرچہ خیال کے لحاظ سے نیچرل

صاف تصنع اور ساختگی پائی جاتی ہے اور بیان نیچرل نہیں رہا۔ اگر زیادہ تفحص کیا جائے تو اُن سے بہت زیادہ صریح اور صاف مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔

اوپر کے بیان سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ اَن نیچرل ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ ممکن ہے متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو قدما کی نگاہ کے علاوہ ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں۔ یا اُسی جولانگاہ کو کسی قدر وسعت دیں یا زبان میں بہ نسبت متقدمین کے زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت اور صفائی پیدا کرسکیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیسؔ نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی ہے اور نواب مرزا شوقؔ نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے۔ اسی طرح دلّی میں ذوقؔ، ظفرؔ اور خاصکر داغؔ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کردیا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عربی و فارسی کی تعلیم ہندوستانی شرفا کے بچوں کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ سرشار نے بھی پہلے اسی طرف توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں دونوں زبانوں میں مہارت پیدا کر لی۔ پھر انگریزی کی طرف مائل ہوئے۔ کیننگ کالج میں داخلہ لیا لیکن تعلیم کی تکمیل نہ ہو سکی اس وقت لکھنؤ میں کئی ادبی رسالے نکلتے تھے۔ مراسلہ کشمیر کے نام سے لکھنؤ کے کشمیری پنڈتوں نے ایک رسالہ نکالا اور سرشار نے بھی اس میں مضمون لکھے۔ اودھ پنچ اس وقت وہاں کے اخباروں میں بیحد مقبول تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہنسی ہنسی میں ملک کی ذہنی اور اخلاقی حالت درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لئے اس میں طنز و ظرافت کے عناصر نمایاں رہتے تھے۔ سرشار بھی اس کے مضمون نگاروں کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز یہیں سے ہوا بعد میں وہ اودھ اخبار کے اڈیٹر ہوئے اور اسی اخبار میں ان کا مشہور ناول فسانہ آزاد نکلنا شروع ہوا۔ اردو میں یہ پہلا ناول ہے جو فنی اعتبار سے بڑے پایہ کی چیز ہے۔

اگرچہ اس میں ظرافت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے لیکن زندگی کی جیسی صحیح اور سچی تصویریں یہاں ملتی ہیں اس دور کے ناولوں میں اور کہیں نہیں ملتی۔

اس کی زبان بھی اعلیٰ درجہ کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سرشار کے پاس ہر طرح کے الفاظ کا اس قدر ذخیرہ موجود تھا کہ وہ ہر طرح کے حالات واقعات اور کیفیات کو صحت اور تشریح کے ساتھ ادا کرنے پر قادر تھے یہ بات اُردو کے بہت کم مصنفین اور انشا پردازوں میں پائی جاتی ہے۔ مکالمے جیسے ان کے ناولوں میں ہیں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ انسانی فطرت کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے موقع اور محل کا وہ خوب خیال رکھتے ہیں۔

ان کی عبارت میں غضب کا جوش پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے محاورات بالخصوص بیگمات کی زبان پر پوری طرح حاوی نظر آتے ہیں اگرچہ انھوں نے فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں۔ عبارت کی سلاست میں فرق نہیں آنے دیا۔ آمد اور بیساختہ پن میں ان کی تحریریں آپ اپنی مثال ہیں۔

۱۸۹۵ء میں سرشار حیدرآباد چلے گئے اور وہاں سے ایک رسالہ دبدبہ آصفی نکالا۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد اپنا کلام انھیں اصلاح کے لئے دکھانے لگے۔ ۱۹۰۲ء میں شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے حیدرآباد میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

ایک نواب زادے کی سیر

آمدِ فصلِ بہاری ہے آج　　جوشِ پر رحمتِ باری ہے آج
زور پر شور گھٹا اُٹھی ہے　　کیسی گھنگور گھٹا اُٹھی ہے

ادھر یہ کالی کالی گھنیری گھٹا چھائی ادھر نواب نامدار نے اپنی فٹن تیار کرائی کہ بُرج پری منزل کی سیر کر آئیں غرض شام کا وقت تھا کہ یہ رئیس زادہ گردوں مدار مع مصاحبین بدکردار ولایتی بلیش بہا فٹن پر سوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھانے نکلے۔ خود گپیں اُڑاتے قہقہے لگاتے تھے اور سمند خوش خرام تیز گام جوانانِ طرحدار کے مزاج کی طرح یوں بل کھاتے چلے جاتے تھے کہ بجلی بھی ان کے مقابل گرد اور چھل بل میں ہرن کی گرمی بازار بھی سرد تھی۔

جھمن نے کہا۔ حضور خدا چشم زخم حوادث سے بچائے اس وقت تو واللہ ریل گاڑی کے بھی انجر پنجر ڈھیلے ہو جائیں دونوں گھوڑیاں چوکڑیاں بھرتی جاتی تھیں اوہو ہو۔ اے صدق علی ابھی پرسوں ہی کا ذکر ہے بڑے حضور کی خواصی میں بندہ بھی بیٹھا تھا۔ پلٹن کے جو جنڈیل ہیں کوئی تیس ہزار روپیہ مہینہ طلب پاتے ہیں۔ بس بس حضور اُن کی مشکی جوڑی اور دونوں ویلا۔ کوئی پانچ پانچ ہزار کے گھوڑے۔ سامنے سے جوڑی آئی اور ہماری گاڑی کے آگے نکال لے گیا۔ اے

حضور یقین مانئے بس پھر تو گھوڑیاں آگ بھبوکا ہو گئیں اور ذقن بھر کر اس طرح جھپٹیں کہ میری مندیل گرتے ہی دو گولی کے ٹپے پر ہو رہی اور کوچبین کے حواس بلا اجازت نفر ور اس کو لاکھ کھڑا کرتا ہے مگر تو یہ ہی بھلی۔ کروروں ہی جتن کئے ایک نہ چلی۔ جنڈیل کی گاڑی تو منزلوں دور رہ گئی اور انھوں نے جا کے جھنٹ پر دم لیا سو وہ بھی بہزار خرابی۔ خداوند اس وقت کنوتیاں دیکھنے کے قابل تھیں اللہ جانتا ہے کھائی کا باپ بھی اس وقت سامنے آتا تو یہ پھاند جاتیں اور ہماری کھوپڑی کے بھی ماتھے جاتیں۔ مگر حضور اُس وقت میاں گھسیٹے نے بھی وہ کام کیا کہ لاٹھ صاحب کے کوچوان سے بھی نہ ہو سکتا اور نیلا تو منہ کے بل زمین پر آ رہتا۔ قسم۔ بس یہ کیفیت تھی کہ جیسے ریل کا انجن ڈبل چال جائے۔

رئیس۔ کیوں جی گھسیٹے تم نے ہم سے یہ واردات بیان ہی نہ کی وہ کون ذبحی تھا۔

گھسیٹے (کوچبین) حضور کوئی پلٹن کا تھا۔ گل پھٹے رکھائے۔ وہ جو یہ چشمہ لگاتا ہے۔

رئیس۔ پھر تم گاڑی نکال لے گئے۔

گھسیٹے۔ اے حضور نکال لینا کیسا خدا جانے جان بچائی۔ اُس دن تو ہم اپنے حساب کو بیچ ہی کر بیٹھے تھے۔ جوں جوں روکتا ہوں ووں ووں وہ اور بھی تیزی کرتی ہے۔ فیض آباد کی سڑک تک ناکوں

دم آگیا۔ ایک بڑھیا کچلتے کچلتے بچی۔

رفیق۔ ہاں! وہ؟ ارے تو یہ خدا نے بڑی خیر کی ورنہ بڑے پھنسے تھے۔

جھمن۔ (جھلا کر) بڑے کیا خاک پھنسے تھے۔ ہماری سرکار سے صاحب لوگوں سے تپاک بڑھا ہوا ہے۔ واللہ بڑھیا مردار کے چاہے پرخچے پرخچے اڑ جاتے مگر حضور کے نوکروں پر آنچ نہ آنے پاتی۔

رفیق۔ خدا خدا کر بندے۔ ہونہہ۔ اے تیری قدرت۔ آپ اور ہم کو سکھائیں میں نے تو یہ بات کہی کہ بوڑھی عورت بے چاری مفت میں کچل گئی ہوتی۔

رئیس زادے نے کوچمین سے کہا کہ میاں گھسیٹے جب جانیں کہ اسی دن کی طرح جوڑی کو تیز کر دو۔ گھوڑیاں ہوا ہو جائیں اور بات کرتے وہاں پہنچائیں۔ کوچمین نے انعام کی طمع سے جوڑی کو تیز کیا تو ہوا سے باتیں کرتی چلیں۔ راستے میں جو دیکھتا ہے کہتا ہے بگھی کیا بھونچال ہے آندھی روگ ہے۔ جوڑی زوروں پر تھی چلتے چلتے موڑ پر ایک کمہار برتنوں کی کھانچی لئے ملا کوچمین نے للکارا۔ سائیس گلا پھاڑ کر چلایا۔ ہائیٹ ہائیٹ آئی یو جانے والا موڑ پر سے ہٹ جانا آئی یو کمہار۔ ارے موڑ پر سے ہٹ۔ کمہار قوت سامعہ سے بے بہرہ اور مارے بوجھ کے پسا جاتا تھا۔ قدم اٹھانا دوبھر۔ اور گھوڑیاں بگٹٹ چلی جاتی تھیں۔ موڑ پہ پہنچتے ہی کمہار جھپیٹ میں آگیا۔ برتنوں کی کھانچی

سر سے گری اور ادھول۔ سب برتن چکنا چور ہو گئے۔ چو طرف تماشائیوں کا ہجوم۔ کسی نے کہا "ہائے ہائے کمہار بے چارہ مر گیا"۔ دوسرا بولا "ٹانگ پاش پاش ہو گئی"۔ تیسرے نے کہا "بیدھا بچارا پکارتے تو جاتے تھے ہٹا ئیوں نہیں۔ دو کوس سے تو گھی کے گھڑ گھڑانے کی آواز آتی تھی؟"

کمہار کا نکھتے کو نکھتے اُٹھا تو ٹانگ میں خفیف سی چوٹ بتائی۔ ادہر کوچبین نے کمہار کے گرتے ہی راس جو اٹھائی تو منڈیاؤں ہو رہا۔ رئیس زادہ باوقار اور مصاحبین حماقت شعار پیچھے پھر پھر کے دیکھتے جاتے ہیں کہ کوئی گرفتار کرنے تو نہیں آتا۔ رئیس زادے کا چہرہ زرد اور رنگ فق ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں پھولے۔ نواب و مصاحب سب چوکڑی بھولے میاں جھمن کا ہنستے ہیں۔ رفیق کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا اور کوچبین کی بس یہ کیفیت تھی کہ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

جب منڈیاؤں پہنچے تو فٹن کو روک کر کوچبین نے پوچھا حضور کیا حکم ہوتا ہے۔

رئیس۔ یہاں ہوش کس نامعقول کے ٹھکانے ہیں جو تم کو حکم دے اُف۔ بس اب مارے پڑے۔ غضب ہی ہو گیا۔ اس کمہار کی تو کوئی خبر لاؤ۔

جھمن۔ حضور بھلا اس وقت تازی تازی واردات ہوئی ہے۔

کس کو جان بھاری ہے جو سانپ کے منہ میں انگلی دے۔

رفیق۔ جو جائے وہی عزت گنوائے۔

رئیس۔ گھسیٹے تم جا کے دیکھ آؤ۔

گھسیٹے۔ اور حضور چوڑی کو یہاں کون سنبھالے گا۔ اس وقت گھوڑیاں بدی پر ہیں۔

رئیس۔ کھول ڈالو اور جاؤ مگر کتے کی چال جاؤ اور بلّی کی چال آؤ۔

گھسیٹے۔ وہ کتے بلّی کی تو حضور نے ٹھیک کہی مگر ماتھے تو غلام کے جائے گی اس تو میرے ہاتھ میں تھی۔ میں جاؤں تو اسی دم دھرا جاؤں۔

رئیس۔ اچھا کسی چاکر کو بھیجدو۔

ایک چاکر۔ نا صاحب ہم کا ساڑھے تین روپیہ کی نوکریاں بہت مل رہی ہیں۔

دوسرا چاکر۔ ہاں ہجور چاکر ہی تو چالتو ہیں۔

رئیس۔ پھر اب ہوتا کیا ہے چودہ چودہ برس کو جائیں گے۔ ہم تو قانون وانون جانتے نہیں۔ چھمن نے کہا "حضور ایک تدبیر غلام کو سوجھی ہے قربان جاؤں جو کبھی پیٹ پڑے" پوچھا "وہ کیا"۔ کہا "حضور تو یہاں اسی جگہ بستر جما دیں اور غلام تراب علی کو لے کر لپکتا ہوا جائے کسی فرنگی کونسلی کے یہاں اور جو رائے وہ دے اُس کے موجب کارروائی ہو" فرمایا واللہ خوب سوجھی "دیکھو جتنی بات ہو گی اتنی

کہیں گے لگی لپٹی سے یہاں نفرت ہے۔ لے بس اب تم جاؤ۔ تراب علی تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ تراب علی بولا حضور اسی دم توپ کے مُہرے پر کہیے چلا جاؤں میں تو نمک پروردۂ قدیم ہوں۔ غلام کو عذر کیا۔ چلو بھئی جھمن"۔

رئیس زادے نے کہا" دیکھو راستے میں کہیں لڑنہ بیٹھنا دونوں کہیں باہم گلخپ۔ تکرار۔ جوتی پیزار ہو تو اصل مطلب ہی غت ربود ہو جائے"۔ کہا اے حضور کیا طاقت۔ اس طرح رہیں جیسے شیر و شکر۔ اس وقت جاں نثاری کا موقع ہے یا گلخپ کا۔ لاحول ولاقوۃ چاہے جان جاتی رہے مگر معاملہ ٹھیک ٹھاک کیے بغیر ملک الموت کو بھی بتے بتائیں گے

میاں جھمن اور تراب علی پو قدمے چلے تو راستے میں یوں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

جھمن۔ گھرے ہیں استاد گھرے ہیں۔

تراب علی۔ اجی ہماری پانچوں گھی میں اور تمہارا سر کڑھائی میں۔

جھمن۔ اب ایک جگہ بیٹھ کر معاملے کی باتیں تو کرو۔

تراب علی۔ اجی تم تو واہی ہو۔ کون بڑا ملیا جوڑ معاملہ ہے چلو چل کے امین آباد والے ساقی کی دکان پر دم لگاؤ۔ پھر ہم سب ٹھیک کر دیں گے۔

جھمن۔ واللہ کیا کہی ہے۔

تراب علی۔ چلو کسی وکیل کے یہاں چلیں کوئی حقیقت اعلیٰ کا مقدمہ

تو ہے نہیں لاکھ دو لاکھ کی جائداد کا مقدمہ بھی نہیں۔ نہ خون کیا، نہ قتل کر کے آئے ہیں۔ ہم تو جانتے ہیں کہ دس پانچ روپے جرمانہ ہو جائیں گے تراب علی نے کہا بس اور کیا۔ بلکن (بلکہ) اس سے بھی کم۔ بہت جرمانہ ہوا تو آٹھ آنے ایک روپیہ۔ تدبیر وہ کرو جس سے یاروں کے ہاتھ گرمائیں اور خوب وارے نیارے ہوں۔

تراب علی۔ ہم جا کے اُس کمہار کی تو خبر لائیں۔

جھمن۔ خدا کرے ضرب شدید آئی ہو۔

تراب علی۔ ہاں مزہ تو جب ہی ہے ورنہ کیا۔ مگر ہم اس کو بھرے دیں گے کہ اب کچھ تو سے مرہی موقع ہے۔

جھمن۔ تم الگ بکاؤ۔ میں الگ پٹی پڑھاؤں۔

تراب علی۔ اجی ہم جانتے ہیں کہ اگر اس مقدمے میں سال سال بھر کے کھانے کو بھی نہ ملا تو کیا۔

جھمن نے کہا ٹلے اور پھر لیے اور بیچ کھیت سے لیے کیونکہ میاں کی سٹی پٹی بھولی ہوئی ہے۔ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔"

ہوٹل

میاں آزاد خانہ برباد یہاں بستر جمانے یا کسی مکان کا قبالہ لکھوانے تو آئے تھے نہیں۔ راہ راہ آئے۔ دو تین دن رہے چلے گئے۔ لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہونچے تو وہ چہل پہل وہ بھیڑ بھڑکا، وہ دھکم دھکا کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا برہمن دیوتا ڈول لئے گھٹ گھٹاتے پھیلے جاتے ہیں۔ جل ٹھنڈے۔ کٹورا الگ کھنک رہا ہے۔ میاں بھشتا مشک یا مشکیزہ لئے ہوئے چہل قدمی کر رہے ہیں ایک سمت ساقی دوسرا خمیرہ بھر کر گڑگڑی لئے گڑگڑا رہا ہے وہ مشکبو کہ دماغ طبلۂ عطار ہو جائے چبوترے کے سامنے کمہار برتن چن کر بیٹھا بیچ رہا ہے۔ مٹی کے کھلونوں پر وہ چوبن کہ باہر والے بصد شوق خرید لے جاتے ہیں۔ خریداروں پر خریدار ٹوٹے پڑتے ہیں پیسہ پھینکا اور حقہ لیا۔ ادھر میاں بھشتا نے تازہ کر دیا اور ساقی نے چلم تیار کی دھواں دھار اڑانے لگے۔ کھٹاک سے نے آواز لگائی۔ گلابی میوہ شہتوت امرس ہے آم کے رسوں کا قلمی آم کے رسوں کا۔ فقیر محمد خاں کے باغ کا سفیدہ۔ بنارس کا لنگڑا چار باغ کا بمبئی رنگترے۔ سنگترے۔ کوے انناس، نارنگیاں

شریفہ، امرود، سیب، جو چاہئے خرید لیجئے۔ ایک طرف حلوائی کی دوکان مٹھائی کے خوان، برفی کے تھال، ورق نقرہ لگے ہوئے پستے کی ہوائیاں، لوہے کے چراغ لٹکے ہوئے ہیں۔ دوکان جھک جھک کر رہی ہے۔ اتنے میں آواز آئی بسکٹ لو بسکٹ کباب کلیجے ادہر اُدہر گھومے تو سامنے ٹوپی والا آن موجود ہوا۔ دو پلی ٹوپیاں شربتی جامدانی، چکن، مری کے کام کی گرہی۔ مندیل گول ٹوپی۔ نئے نئے فیشن۔ نرالی اور انوکھی وضع کی ٹوپیاں جھڑا جھڑ دکھا رہا ہے اور گاہک پر گاہک بصد شوق دام چکا رہا ہے۔ دس پانچ ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ دور دور تک مسافر بستر جمائے۔ کوئی زین پوش، کوئی دری بچھائے ریل کی راہ تک رہا ہے کوئی گنوار اکڑوں بیٹھا ناپ تناپ بک رہا ہے، میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ اللہ اللہ ریل کا اسٹیشن کیا ہے خاصہ میلہ ہے، کچھ ٹھکانا ہے، یہ بھیڑ، یہ دھوم، یہ رونق، بھئی واہ رے لکھنؤ واللہ ایسا اسٹیشن بھی نہیں دیکھا۔ میاں آزاد ٹہلتے ہوئے اسٹیشن کے اندر گئے۔ ہوٹل دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ اُہو ہو ہو کیا صاف و شفاف ہی ہر شے قرینے سے چنی ہوئی۔ در و دیوار سے صفائی برس رہی ہے۔ ہر سمت نور کا عالم ہے۔ اس سرے سے اُس سرے تک میز اور اس کے گرداگرد کرسیاں گلاس چنے ہوئے لمپ اور کنول ہر طرف روشن ہیں میاں آزاد بھی کرسی پر جا کر ڈٹ گئے کھانا لاؤ۔ مگر شراب کا لگاؤ نہ ہوا اور لحم خوک قریب نہ آنے پائے۔ ایک چپراسی صاف ستھرے کپڑے پہنے

ہوئے چوبداروں کی سی پگڑی باندھے ہوئے سامنے آن کھڑا ہوا حضور شراب تو نہ ہوگی مگر اور کیا آپ نے حکم دیا میاں آزاد نے کہا لحم خوک (آہستہ سے) یعنی سور کا گوشت نہ ہو (چپراسی) نا حضور کیا مجال یہ کہکر چپراسی نہایت ہی قیمتی بیش بہا پلیٹوں میں طرح طرح کا انگریزی کھانا لایا۔ میاں آزاد نے چھری کانٹے سے خوب مزے سے چکھا اور سوڈا واٹر اور لیمونیڈ پیا اور باہر پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی بھی بستر جمائے ہوئے پڑا ٹھے اور کباب کلیجے چکھ رہے ہیں۔

آزاد۔ واہ اُستاد تم تو خوب مزے سے کباب اُڑا رہے ہو۔

خوجی۔ پھر کوئی شراب اُڑائے کوئی کباب کھائے۔

آزاد۔ ایں! شراب! لاحول ولا قوۃ۔ اے میاں شراب کس نے منہ سے لگائی یہ کس کی شامت آئی۔ یہاں دخت رز سے واسطہ ہی نہیں رکھتے۔ بنت العنب کے عاشق دلدادہ کوئی اور ہی ہوں گے۔ ع

کردم ز شراب ناب توبہ

خوجی۔ اور آگے تو کہئے۔ ع کردم ز شراب ناب توبہ اور آگے ع

وز کردہ ناصواب توبہ

آزاد۔ قسم قرآن کی کس مردک نے شراب کا ایک قطرہ بھی چھوا ہو شراب پی ہو تو سور کا گوشت کھایا ہو۔

خوجی۔ (مسکرا کر) تسلیم ایک نہ شد دو شد۔ آپ نے سور کا گوشت بھلا کب چھوٹا ہوگا۔ واللہ مانتا ہوں۔ کہنے لگے شراب پی ہو تو سور کا

گوشت کھایا ہو۔ معقول! یہ تو آپ تب کہیں جب اُس کو حرام یا مکروہ بھی سمجھیں۔ آپ دونوں کو حلال اور اُن کے استعمال کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ یار آج تو تم نے غضب ہی کر دیا۔

آزاد۔ اے بھئی آخر کیا کیا، کچھ کہو گے بھی، یا ملّاہی سنائے جاؤ گے۔ سبحان اللہ۔ قسم لو جو ہم نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو، یا سؤر کے گوشت کی صورت بھی دیکھی ہو۔

خوجی۔ ہاں یہ آپ نے خوب کہی کہ سؤر کے گوشت کی صورت نہیں دیکھی ہوگی۔ مگر یار مزا تو خوب چکھا ہوگا۔ اور شراب کو ہاتھ آپ کیوں لگاتے، گلے لگائی ہوگی، گلے! اور آپ کی قسم کا کس مردود کو اعتبار ہے۔ قسم کو تو آپ مانتے ہی نہیں۔ مجھے آج تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ آپ کا دین ایمان کیا ہے۔ تمہارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ خیر جی اپنی اپنی سب بھگت لیں گے ہم کو اس جھگڑے سے کیا واسطہ۔

آزاد۔ نہ ہاری مانتے ہو نہ جیتی۔

خوجی۔ مانیں کیا خاک۔ مانیں کیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھری کانٹا کھٹا کھٹ چل رہا ہے۔

آزاد۔ تو بھائی چھری کانٹے سے کوئی شراب پیتا ہے۔

خوجی۔ ہم کیا جانیں۔ ہماری جانے جوتی کہ شراب کیوں کر پیتے ہیں۔ یہ کیسی اپنے ایسے میگسار بادہ خوار سے تحقیقات کیجئے۔ افسوس، واللہ لیں ہم گئے گذرے۔ ہائے ستم۔ خیر مضیٰ مامضیٰ۔

آزاد - آپ ایک کام کیجئے۔ ہوٹل میں جا کر۔

خوجی - اے لاحول۔ اے لاحول۔ خدا ایسی جگہ کسی سچّے اور پکّے مسلمان کو نہ لے جائے۔ توبہ توبہ (اپنے کان پکڑ کر) خداوندا بچائیو گنہگار بندہ ہوں۔ ارے توبہ۔ ہوٹل میں اور ہم جائیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ بس آپ ہی کو مبارک رہے۔ قبلہ بندہ درگذرا۔

میاں آزاد ٹہلنے لگے اور خوجی نے کباب اور کلیجوں پر خوب ہی ہاتھ لگائے جب صفاچٹ کر چکے تو حلوائی کی دوکان سے برفی لائے اور افیون کے نشے میں ٹونگا رنے لگے، تو اتنے میں ایک صاحب باریش دراز بمقدار وپنجاہ انگشت نے میاں آزاد کو مخاطب کر کے کہا کیوں حضرت آپ کا اسم مبارک۔ یہ بولے میاں آزاد۔ وہ مسکرائے اور کہا کہ ہاں واللہ۔ آپ کے قدو قامت اور وضع قطع پر یہ نام موزوں ہے۔ آزادی اور آزادہ روی صورت سے برستی ہے۔ ملّت کیا ہے۔

آزاد نے کہا ؎

از مذہبم مپرس نہ مومن نہ کافرم　　من رسم ایں دیار ندانم مسافرم

حضرت بندہ مسلمان ہے اور مسلم ایمان ہے۔ پابند شرع۔ آپ کا اسم شریف جناب مولوی صاحب۔

مولوی صاحب - اسم شریف تو چھپر پر رکھئے اس وقت مجھے افسوس کرنے دیجئے۔

آزاد - بسم اللہ آپ افسوس کرلیجئے بلکہ رو دیجئے۔ مگر سنئے تو سہی

محرم الحرام کے دن قریب ہیں خوب پیٹ بھر کر رو لیجئے گا ایسی بیتابی کیا ہے

مولوی صاحب۔ آپ مسلمان اور پابند شرع اپنے آپ کو بتاتے ہیں اور ہوٹل میں جا کر شراب خانہ خراب استعمال میں لاتے ہیں عیاذاً باللہ مرد خدا آخر انجام کی بھی فکر ہے یا سگ دنیا ہی بنے رہو گے۔

آزاد۔ قبلہ بس اب کیا کہوں بجز سکوت کے اور کوئی کلمہ زبان پر نہیں آنے پاتا۔ لاحول ولا قوۃ۔

مولوی صاحب۔ بے ادبی معاف۔ لاحول تو آپ اپنے ہی اوپر پڑھتے ہیں۔ آپ سے حرکت شیطانی ہی ایسی سرزد ہوئی مگر بحمداللہ کہ آپ کا نفس لوامہ آپ کو ملامت تو کرتا ہے۔

آزاد۔ مولانا خدا کی قسم۔ میں نے ہوٹل میں صرف کھانا کھایا، مگر وہ اغذیہ جو شرع کی رو سے حرام نہیں۔ بس نظر انصاف سے دیکھئے تو اس میں قباحت ہی کیا ہے آخر روم میں بھی تو صغیر و کبیر اور بڑے بڑے علماء تحریر علیائیوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ پھر یہاں ہندوستان کے مسلمان اس کو داخل گناہ کیوں سمجھنے لگے، میں نے کیا کفر کیا کہ مردود اور مطرود اور زندیق اور ملحد اور مرتد بنایا جاتا ہوں۔

مولوی صاحب۔ مجھ سے سنئے میں عرض کروں۔ ہوٹل میں جانا اہل اسلام کے لئے مستحسن نہیں۔ جو کھانا آپ نے ہوٹل میں چکھا ہے اگر باہر منگوا کر اور فرش بچھوا کر چکھتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا گو یہ بھی معیوب تھا۔ مگر اس درجہ نہیں پھر آپ لاکھ قسمیں کھائیے قرآن اٹھائیے یقین کس ملعون کو آئیگا

کہ آپ نے شراب نہیں پی یا سور کا گوشت نہیں کھایا۔ کاجل کی کوٹھری میں جو جائے گا وہ منھ کالا کر کے آئے گا۔ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے ہی ہوتے ہیں۔ رومی لاکھ عیسائیوں کے ساتھ لقمے لگائیں اور بے تکلفی سے کھائیں ہم کو تو ایسا نہ چاہیئے۔ ہمارے رسوم کے خلاف ہی آپ کو روم میں رہنا ہے یا ہندوستان میں۔ روم کی بات روم کے ساتھ ہی ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خیالات کا تذکرہ ہے یا روم اور رومیوں کی عادات کا۔ آخر باہر بھی تو کباب' کلچے' شیرمال' پراٹھے' باقرخانی' روغنی روٹی' بسکٹ سب ہی کچھ بکتا ہے پھر وہاں کھاتے ہیں کون ہنر تھی مفت میں اپنے آپ کو نکو بنانا اور ہنسوانا کون سی دانائی ہے۔

آزاد۔ حضرت وہاں اوّل تو کھانا عمدہ اور لذیذ۔ دوسرے مقام صاف وشفاف۔ جس لطف سے ہم نے وہاں کھانا کھایا وہ یہاں کجا' قلعی کھرا۔ صاف ستھرا پنکھا جھل رہا ہے پلیٹیں صاف' میز شفاف' چار چار بیرا اسی خدمت کے لئے کھڑے ہیں۔ یہاں یہ باتیں کجا' لاحول ولا قوۃ۔

مولوی صاحب۔ کھانا عمدہ تو آپ سب سمجھتے ہوں گے۔ باقی رہا پنکھا ایک پیسہ دے دیجئے۔ گھنٹہ بھر پنکھا جھلوا لیجئے۔ اور صفائی کو مسافرت سے کیا کام سوائے ازیں یہاں بھی کوئی غلیظ شے نہیں ہے۔ یوں وحشت کی بات ہی اور ہے خیر حضرت آپ جانیں اور آپ کا کام جانے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پند پیر دانا را

مانو یا نہ مانو۔ اس سے یہاں غرض نہیں۔ ماننا نہ ماننا آپ کے ہاتھ ہے ہم نے کہہ دیا۔

میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا کہ آج سے ایسی حماقت نہ کریں گے کہ ڈنکے کی چوٹ پر ہوٹل میں جائیں۔ اور مفت میں اپنے آپ کو ہنسوائیں یوں تو ہمیں اختیار رہے کہ چاہے ہوٹل میں جائیں یا جو کھائیں۔ مگر خاموشی کے ساتھ یہ نہیں کہ اسٹیشن بھر میں گھومتے پھریں کہ ع

ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

خوجی۔ کیوں بھلا خیر۔ ایک ہمیں کو آپ اُلّو بناتے تھے اب تو ایک مولوی صاحب نے آپ کو قائل کر دیا۔ ہات ترے کی اور ہوٹل میں کھاؤ۔

مولانا شبلی نعمانی

علامہ شبلی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و دینداری اور جاہ و عزت میں ممتاز تھا۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کی اور اس کے بعد غازی پور، رام پور، لاہور رہ کر مختلف اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ والد کے اصرار پر امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی مگر یہ پیشہ ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ اور اس لئے ترک کر دیا۔ ۱۸۸۲ء میں سرسید نے ان کو چالیس روپیہ ماہوار پر علی گڑھ کالج میں ملازم رکھ لیا۔ سرسید کی وفات کے بعد اس ملازمت سے بھی مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد مولوی سید علی بلگرامی کے وساطت سے حیدر آباد پہنچکر ناظم علوم و فنون کا عہدہ پایا۔ چار سال وہاں رہے۔ واپسی پر ندوۃ العلماء کے ناظم بنائے گئے اور اس ادارہ کو از سر نو زندہ کر دیا۔ لیکن دوسرے علماء کی مخالفت سے تنگ آکر آخر دستکش ہو گئے اور اعظم گڑھ آ گئے۔ یہاں ایک علمی ادارہ دار المصنفین کے نام سے قائم کیا جو بحمد اللہ ابھی تک جاری ہے اور علم و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں شبلی نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ علامہ شبلی ایک بلند پایہ ادیب سلیم المذاق نقاد وسیع نظر مورخ فلسفی عالم دین اور رنگین بیان شاعر تھے اردو ادب میں

ان کے قلم نے جو اضافہ کیا ہے وہ نہ صرف حجم، تعداد اور تنوع کے اعتبار سے گرانقدر ہے بلکہ خوبی اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی بے بہا ہے۔ سرسید نے اُردو انشا میں جس طرز کی بنیاد ڈالی تھی شبلی اس کے خاتم ہوئے۔ سرسید اور ان کے ہم طرز جو زبان لکھتے تھے اس کی ایک خصوصیت تو یہ بھی کہ مقفّٰی فقرے لفظی تعقد مبالغہ اور خیال آرائی تشبیہیں اور استعارے بہت کم ہوتے تھے ان کی عبارت متقدمین کے مقابلہ میں صاف سلیس اور دل نشیں ہوتی تھی اور ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ تمام مصنفین مغربی خیالات سے آشنا ضرور تھے لیکن انگریزی ادب سے براہ راست اتنی واقفیت نہ رکھتے تھے کہ اسالیب بیان اور طرز ادا انگریزی مصنفین سے لے کر اپنی زبان میں سموتے۔ شبلی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔

سرسیّد اور شبلی کا مقابلہ کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کی نثر کان سے نکلا ہوا ہیرا ہے جا بجا مکدّر، ناہموار اور بدوضع۔ لیکن رفتہ رفتہ سرسید اور ان کے رفیق اس جواہر ریزہ کو زیر مشق رکھ کر عیوب سے پاک کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شبلی کی چالاک دستی اس کو کوہ نور کی طرح مجلّیٰ، مصفّا اور ہر پہلو سے مکمل کر دیتی ہے۔ شبلی کے یہاں سب کچھ ہے۔ سلاست بھی ہے زور بیان بھی ہے، لطیف و نازک تشبیہیں اور استعارے بھی ہیں۔ لیکن ہر چیز برمحل ہے، خوب صورت ہے۔ مناسب ہے۔ شبلی کے بعد جو دور آیا اس میں مغرب کی تقلید اتنی بڑھ گئی کہ خیالات سے گذر کر اہل قلم کے طرز نگارش میں انگریزی ادائیں چھلکنے لگیں۔ اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

واقعہ نگاری

اُردو زبان کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے۔

فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں جن کے خیالات باریکی اور تاریکی عبارات میں جگنو سے اُڑتے نظر آتے ہیں لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصلی ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں، ایسی ماں کا دودھ پی کر اُردو نے پرورش پائی تو اُس کا کیا حال ہوگا۔

فارسی کے متعلق تو یہ الزام تسلیم نہیں کیا جا سکتا، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اُردو میں جس چیز کی بڑی کمی ہے وہ یہی واقعہ نگاری ہے۔ شاعری کی جو صنفیں اُردو میں آئیں وہ قصیدہ اور غزل تھیں، ان دونوں کو واقعہ طرازی سے کوئی نسبت نہ تھی، مثنویاں جو لکھی گئیں وہ مورخانہ نہیں بلکہ عاشقانہ تھیں، اس لئے اصلی واقعات کے اظہار کی چنداں ضرورت پیش نہیں آئی۔ اُردو زبان کی نسبت جو کم مائگی کی شکایت ہے وہ زیادہ تر اسی لحاظ سے ہے کہ وہ ہر قسم کے واقعات، معاملات، کاروبار، معاشرت کے جزئیات کے ادا کرنے پر قادر نہیں، اسی بنا پر، اگر اُردو نظم میں کوئی تاریخ کی کتاب لکھنا چاہیں تو نہیں لکھ سکتے۔

واقعہ نگاری کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ واقعہ نگار کسی تاریخی واقعہ کو بے کم و کاست نظم کر دے، اس کے لئے صرف زبان پر قدرت درکار ہے۔ شاعری کی چنداں ضرورت نہیں۔

۲۔ واقعہ اجمالاً معلوم ہے۔ لیکن واقعہ نگار واقعہ کے تمام جزئیات اور حالات اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہے وہ واقعہ کی نوعیت کو دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس قسم کے موقع پر فطرت کا اقتضا کیا ہے ان تمام چیزوں کو وہ موجود فرض کر لیتا ہے اور ان کو ادا کرتا ہے۔

اس قسم کی واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے بالکل بیان واقعی ہو۔ اور تمام واقعات میں اس قسم کا تناسب، ربط، اور موزونی ہو کہ کسی واقعہ کی نسبت شک کا احتمال بھی نہ آنے پائے۔ اس قسم کی واقعہ نگاری کے لئے صرف قدرت زبان کافی نہیں، بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا درکار ہے۔

مثلاً شاعر۔ احباب کی جدائی کا واقعہ لکھنا چاہتا ہے تو اُس کو ان جزئی کیفیتوں پر نظر ہونی چاہیئے جو اس حالت میں پیش آتی ہیں مثلاً یہ کہ اس حالت میں ایک دوسرے کو کس حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے؟ کس قسم کی باتیں کرتا ہے؟ کن باتوں سے دل کو تسلی دیتا ہے؟ رخصت کے وقت بے اختیار کیا حرکات صادر ہوتے ہیں آغاز کی کیفیت کس طرح بہ تدریج ترقی کرتی جاتی ہے؟ حاضرین پر ان سے کیا اثر پڑتا ہے؟ پھر جدائی میں بھی فرق ہے؟ باپ بیٹے کی جدائی، بھائی بھائی کی جدائی۔ زن و شوہر کی جدائی، احباب کی جدائی، ان میں سے ہر ایک کی الگ

الگ خصوصیات ہیں ان مختلف اور کثیر الانواع خصوصیات کا احاطہ کرنا اور ان کو مؤثر پیرایہ میں ادا کرنا شاعرانہ واقعہ نگاری ہے۔

اسی طرح لشکر کشی، معرکہ آرائی، فتح و شکست سفر و حضر، بیماری و موت قید و بند، دشت نوردی و بادیہ پیمائی، سیکڑوں ہزاروں واقعات ہیں اور ہر واقعہ کے سیکڑوں جزویات ہیں۔ ان تمام کا احاطہ کرنا، اور اُن کو ہو بہو ادا کر سکنا کمال شاعری ہے۔

اردو زبان میں چونکہ ایک مدّت تک بیہودہ مبالغہ اور خیال بندی کی گرم بازاری رہی، اس لئے واقعات کے ادا کرنے کے لئے جو الفاظ ترکیبیں اصطلاحات مقرر ہیں۔ استعمال میں نہیں آئیں۔ اس لئے آج نئے سرے سے ان کو استعمال کیا جائے تو یا ابتذال یعنی عامیانہ پن یا غرابت یعنی رُوکھا پن پیدا ہو جاتا ہے نظیر اکبر آبادی کے کلام میں جو سوقیانہ پن ہے اس کا بھی راز ہے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں اکثر واقعات کا سماں دکھانا چاہا ہے اور یہ اُن کی صحیح المذاقی کا نتیجہ ہے لیکن اکثر جگہ ابتذال پیدا ہو گیا ہے۔ ع کرٹے کو چھڑے سے بجاتی چلی۔ اگر واقعہ نگاری ہے تو شعرا نے اچھا کیا کہ واقعہ نگاری سے الگ رہے۔

واقعہ نگاری جب کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اُس کو مرقع نگاری کہتے ہیں۔ جس کو آج کل کی زبان میں کسی چیز کا سماں دکھانا یا سین دکھانا کہتے ہیں۔

میر انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجہ تک پہنچایا ہے اُردو

کیا فارسی میں بھی اس کی نظیریں مشکل سے مل سکتی ہیں، ان کے کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ہر قسم کے معاملات و واقعات و حالات اس کثرت سے نظم کئے ہیں کہ واقعہ نگاری کی کوئی صنف باقی نہیں رہی جو اُن کے کلام میں نہ پائی جاتی ہو۔

۲۔ کوئی واقعہ جب سامنے آتا ہے تو عام نگاہیں صرف نمایاں باتوں پر پڑتی ہیں اور اس لئے جب لوگ اُن کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو اُن ہی نمایاں باتوں کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن ایک دقیق النظر اُن تمام جزویات پر بھی نظر ڈالتا ہے اور اُن کو ظاہر کرتا ہے یہ جزویات جب ادا کئے جاتے ہیں تو سامعین پر اس طرح کا اثر پڑتا ہے۔ گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی، اس کے علاوہ واقعہ کی پوری پوری تصویر کھنچنے سے دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے یہ جزویات اکثر شعراء نذر انداز کر جاتے ہیں جس کی وجہ اکثر تو یہ ہوتی ہے کہ ان پر عام نگاہیں پڑ نہیں سکتیں اور زیادہ تر یہ کہ ہر شخص ان کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا لیکن میر انیس چونکہ فطرت اور معاشرت انسانی کے بہت بڑے راز داں ہیں۔ اس لئے دقیق سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی اُن کی نظر سے بچ نہیں سکتا اس کے ساتھ زبان پر یہ قدرت ہے کہ کہیں اُن کو دقت پیش نہیں آتی۔

مثلاً ایک موقع پر گھوڑے کی تیز روی کو لکھا ہے، قاعدہ ہے کہ گھوڑا جب حد سے زیادہ تیز دوڑتا ہے تو اکثر اُس کی دونوں کنوتیاں کھڑی ہو کر

مل جاتی ہیں۔ اس کو بعینہٖ اس طرح ادا کیا ہے۔

ع۔ دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

حضرت عباسؑ جب نہر کے پاس پہنچے ہیں تو گھوڑا جو کئی دن کا پیاسا تھا پانی دیکھ کر بیتاب ہو گیا ہے۔ لیکن حضرتِ عباسؑ اُس کو پانی پینے سے روکتے ہیں اس موقع پر واقعہ کی اصلی صورت کھینچنے کے لئے یہ ضرور ہے کہ اس کشمکش کے موقع پر جو اضطرابی حالت پیش آسکتی تھی وہ دکھائی جائے چنانچہ میر انیس کہتے ہیں ؎

دو دن سے بے زبان پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا۔ سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرتِ عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

سفر قسطنطنیہ

۲۰ مئی صبح کے وقت ازمیر پہونچے چونکہ یہ ایک بہت بڑا بندرگاہ ہے، جہاز دو روز تک یہاں مقیم رہا میں اپنے شامی دوستوں کے ساتھ جہاز سے اترا کنارہ پر وہی تذکرہ راہداری کی باز پرس تھی۔ لیکن صدر مقام ہے اور اس صوبہ میں اس سے زیادہ وسیع اور آباد شہر نہیں ہے۔ قدامت اور تاریخ کے لحاظ سے بھی ایک یادگار مقام ہے۔ ہومر جو یونان کا مشہور شاعر گذرا ہے اور جس کی نسبت یورپ کا خیال ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا اس کی قبر یہیں ہے۔ سات مقدس گرجے جن کا ذکر انجیل کے سفر دریا میں ہے اُن میں سے ایک اسی شہر میں تھا۔ زمانے کے انقلابات نے اس کو دس دفعہ تباہ و برباد کیا۔ تاہم اس کی موجودہ آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ اطراف کی زمین نہایت سیر حاصل ہے۔ اور خود شہر تجارت کا بہت بڑا مرکز ہے ہمیشہ بیسیوں دخانی اور بادبانی جہاز بندرگاہ میں موجود رہتے ہیں ریل بھی یہاں جاری ہے اور دو وقت یہاں سے ٹرین بھی روانہ ہوتی ہے اسلامی آثار بکثرت ہیں۔ لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ مسجدوں کی تعداد تین سو سے کم نہیں جن میں بعض بڑی شان و شوکت کی ہیں۔

جہاز سے ہم اُترے تو نہایت بلند اور شاندار عمارتوں کا سلسلہ نظر آیا جو دور تک بخط مستقیم دریا کے کنارے کنارے چلا گیا ہے۔ یہ عمارتیں ہوٹل،

قہوہ خانہ تھیٹر۔ ناچ گھر اور عیسائی تاجروں کی دوکانیں ہیں۔ اور نہایت خوش منظر اور پر فضا ہیں۔ رات کے وقت ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میلہ یا شادی کی تقریب ہے۔ قہوہ خانوں اور ناچ گھروں کے علاوہ سڑک پر کثرت سے مجمع رہتا ہے۔ اور جدھر جاؤ نغمہ وسرود کی آواز آتی ہے اس سلسلہ عمارت کے عقب میں عیسائیوں کا محلہ ہے اور اس قدر بلند اور عالیشان عمارتیں ہیں کہ میں نے اب تک کہیں نہیں دیکھیں۔ اس محلہ کے تمام گلی کوچے نہایت صاف اور ہموار ہیں۔

اس محلہ کی سیر سے فارغ ہو کر میں نے شہر کا رخ کیا۔ شہر اگرچہ نہایت پُر رونق ہے اور آدمیوں کی کثرت سے ہر وقت ایک میلہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن تمام سڑکیں ناہموار نا صاف ہیں۔ اور گلی کوچوں میں تو نجاست اور کیچڑ کی وجہ سے راستہ چلنا مشکل ہے حقیقت یہ ہے کہ ان تمام ممالک میں میونسپلٹی کا انتظام نہایت خراب ہے اور حکومت ترک کے لئے یہ ایک نہایت قابل الحاظ امر ہے کہ چلتے چلتے ہمارے شامی دوستوں کو بھوک لگی اور ایک نان بائی کی دوکان پر جا بیٹھے۔ مجھ کو اگرچہ اشتہا نہ تھی لیکن ان کے اصرار سے شریک ہوا۔ نان بائی کے لفظ سے ہمارے ناظرین کو ہندوستان کے نان بائیوں اور اُن کی ذلیل دوکانوں کا خیال آیا ہوگا۔ لیکن یہ قیاس صحیح نہیں۔ یہاں معمولی سے معمولی دوکان کی آراستگی کی یہ صورت ہے کہ متعدد چھوٹی میزیں اور اُن کے گرد کرسیاں لگی ہیں۔ میزوں پر نہایت صاف چادر بچھی ہوئی ہے۔ دیوار کے ایک گوشہ میں

مولانا مصطفےٰ آفندی امام جامع مسجد و مدرس صبری آفندی مدرس کتب اعدادی ۔ مولانا سعید شکری بک حسنی آفندی مہتمم تعلیمات، سلام علیک اور مزاج پرسی کے بعد ایک صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگ ابھی ایک مسئلہ کے متعلق گفتگو کرتے تھے اگر آپ پسند کریں تو وہ مسئلہ پھر چھیڑا جائے۔ میں نے خوشی سے منظور کیا اور میں نے کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی اور تمام حاضرین نے اس سے اتفاق کیا۔ یہ لوگ عربی نہیں سمجھتے تھے اس لئے میں فارسی زبان میں گفتگو کرتا تھا ان ملکوں میں بحث و مذاکرہ کا یہ طریقہ عموماً رائج ہے۔ اور نہایت شائستہ طریقہ ہے اجنبی شخص کو علماء کے گروہ سے ملنے اور ان سے ربط و اختلاط پیدا کرنے کا اس سے زیادہ اور مفید کوئی ذریعہ نہیں بڑی خوبی یہ ہے کہ مناظرہ نفسانیت اور ترفع کے لحاظ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اثنائے تقریر میں اگر ان کو انداز سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب اعتراض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو قصداً دوسرا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ اس قسم کی علمی مجلسیں اس سفر میں میری کامیابی کا بڑا ذریعہ تھیں اور بعض جگہ تو انہیں کی بدولت مجھ کو ایسی دشواریوں سے نجات ملی جن سے رہائی کی اور کوئی تدبیر نہ تھی۔

۲۱ مئی کو شام کے وقت جہاز نے لنگر اٹھایا یہاں سے قسطنطنیہ تک کوئی بڑا اسٹیشن نہیں ہے بعض بعض مقامات پر جہاز تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرا لیکن ہم اتر نہ سکے یہ مقامات زیادہ تر جنگ کی ضرورتوں کے لئے ہیں اور ہر جگہ کثرت سے جنگی آلات فراہم ہیں چناق قلعہ ایک مقام ہے

ٹونٹی لگی ہے اور اُس کے نیچے طشت اور دائیں طرف صابون اور تولیہ رکھا ہے
یہ نہایت معمولی دو کانوں کی کیفیت ہے۔ اور بڑی بڑی دوکانیں جن کو ہوٹل
کہا جا سکتا ہے نہایت پُر لطف اور پُر شان ہیں لیکن اس طرح کے جتنے ہوٹل
ہیں عموماً عیسائیوں کے ہیں۔

میں نے مدرسوں کی سیر کرنی چاہی۔ لیکن چونکہ جمعہ کا دن تھا۔ تمام مدرسے
بند تھے نماز جمعہ جامع حصار میں پڑھی۔ یہ مسجد پر تکلف اور آراستہ ہے۔
چھت پر طلائی نقش و نگار ہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ صحن کے دونوں طرف
دو بڑے بڑے گھنٹے لگے ہیں۔ جن سے اوقات نماز معلوم ہونے کے ساتھ
مسجد کی زیبائش بھی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں اس کی تقلید کی جاتی
تو اچھا ہوتا۔ خطبہ و نماز میں یہاں بعض جدتیں ہیں۔ گو نہ شریعت میں اُن
کی کچھ اصل ہے نہ بجائے خود وہ موزوں ہیں خطیب جب خطبہ پڑھتا ہے
تو بیچ بیچ میں رکتا جاتا ہے۔ اس وقت چند اشخاص آواز ملا کر کچھ پڑھتے
ہیں۔ یہ چپ ہوتے ہیں تو خطیب پھر شروع کرتا ہے اور اس طرح کئی بار
اتفاق ہوتا ہے۔ نماز میں عموماً چھوٹی سورتیں پڑھتے ہیں جو تین چار آیتوں
سے زیادہ نہیں ہوتیں حالانکہ تمام دنیا میں جمعہ کی نماز میں بڑی سورتوں
کے پڑھنے کا دستور ہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد کتب خانہ میں گیا
کوئی بڑا کتب خانہ نہیں ہے۔ مسجد کے کونہ میں ایک چھوٹا سا حجرہ ہے اور
کتابوں کی تین چار چھوٹی المماریاں ہیں۔ نماز کے بعد اکثر علماء اور ارباب
تصانیف یہاں آکر بیٹھتے ہیں جس وقت میں پہنچا صاحب ذیل تشریف فرما تھے

جہاں نہایت مضبوط قلعہ ہے لوگوں نے مجھ سے بیان کیا محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ کے فتح کرنے کا عزم کیا تو اس وقت توپیں گولے کا عام رواج نہ تھا۔ محمد نے خود توپیں ڈھالیں اور مٹی کا گولہ بنوایا جن میں سے چند یادگار کے طور پر اب بھی محفوظ ہیں۔ یہ گولے پختہ اور نہایت مضبوط ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ لوہے کے گولوں سے کم نہیں ازمیر سے قسطنطنیہ تک دریا کے دونوں طرف ایسے محفوظ قلعے اور دمدمے تیار کئے ہیں اور اس کثرت سے سامانِ جنگ موجود ہے کہ قوی سے قوی سلطنت بھی اس راستے سے دارالسلطنت پر حملہ کرنے کا قصد نہیں کر سکتی یہ تمام قلعے اور دمدمے ہر فاتح کے عہد کے ہیں۔ یہ نامور شہنشاہ جب قسطنطنیہ کی تسخیر کے ارادے سے بڑھا تو راہ میں جا بجا جنگی چھاونیاں بنوائیں اور قلعے اور دمدمے تیار کرائے لیکن یہ تمام تفصیل لوگوں کی زبانی روایت ہے میں نے تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں کی ہے چنانچہ قلعہ سے آگے بڑھ کر ہم نے عجیب تماشہ دیکھا جہاز تیزی سے جا رہا تھا کہ دور سے پانی میں ایک فوارہ سا چھوٹتا نظر آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ سامنے سے چار پانچ مچھلیاں جہاز کی طرف دوڑی آرہی ہیں قریب آگئیں تو جہاز کے ساتھ ہولیں۔ ان کا جسم پانی کی سطح سے صاف نظر آتا تھا۔ جہاز اگرچہ نہایت تیزی سے جا رہا تھا لیکن وہ برابر ساتھ ساتھ آتی تھیں۔ کبھی کبھی جب سانس چڑھ جاتی تھی تو بڑے زور سے پھنکارتی تھیں اس وقت پانی میں فوارہ سا چھوٹتا نظر آتا تھا۔ قریباً دو تین میل تک جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑیں تمام لوگ حیرت سے تماشہ دیکھتے تھے۔

بعضوں کو خیال ہوا کہ ان مچھلیوں نے کبھی جہاز کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے اس کو کوئی جانور سمجھیں اور مقابلہ کے جوش میں چاہتی تھیں کہ جہاز ان سے بڑھنے نہ پائے واپسی کے وقت بھی ایسا ہی اتفاق ہوا۔ اور اس وقت دریافت سے معلوم ہوا کہ اس مقام پر ایک دفعہ اتفاق سے یہ مچھلیاں آگئیں تھیں اور جہاز کے ملازموں نے ان کے لئے کھانے کی کوئی چیز دریا میں ڈال دی تھی اس کی طمع پر جب کوئی جہاز ادھر سے گذرتا ہے تو اکثر یہ مچھلیاں آجاتی ہیں اور دور تک جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہیں۔

۲۳ مئی صبح کے وقت قسطنطنیہ پہونچے جہاز نے لنگر کیا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ مجھ کو منزل مقصود پر پہنچنے کی نہایت خوشی ہونی چاہئے تھی لیکن قلیوں اور ملاحوں کے ہنگامے اور شور وغل میں میرے حواس جاتے رہے۔ ملاحوں نے تمام جہاز گھیر لیا۔ ان کے شور وغل اور کشاکش سے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ میں نے پہلے سے کچھ طے نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتا تھا کہ جہاز سے اُتر کر کہاں جاؤں۔ ہوٹل میرے مناسب حال نہ تھا (اس کی وجہ آگے چل کر معلوم ہوگی) اور سراؤں پر ناواقفیت کی وجہ سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ سخت مصیبت یہ ہوئی کہ شامی احباب جن سے ہر قسم کی مدد کی توقع ہو سکتی تھی ان کو کالج میں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لئے وہ میرا انتظار نہ کر سکے۔ مجھ کو اکیلا پا کر ملاحوں اور قلیوں نے اور بھی دق کرنا شروع کیا۔ میرا اضطراب اس خیال سے اور بڑھتا جاتا تھا کہ جہاز پر اجنبیت کی وجہ

سے یہ دقت ہے تو شہر میں کیا حال ہوگا؟ اس لیت ولعل میں زیادہ دیر ہوئی جاتی تھی اکثر مسافر جہاز سے اتر گئے اور اترتے جاتے تھے آخر خانساماں کو اسباب سپرد کیا اور اس سے کہا کہ میں شہر کی سیر کر کے واپس آتا ہوں مقصد یہ تھا کہ پہلے شہر میں جا کر قیام کا کچھ انتظام کر آؤں تب اسباب جہاز سے اُتاروں۔ شام کے چند عربوں نے ایک کشتی کرایہ کی تھی میں بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔ کنارہ پر تذکرہ کی پولیس موجود تھی۔ میں نے انگریزی چٹھیاں دکھائیں لیکن وہ پاسپورٹ مانگتے تھے۔ غرض ہزار دقت رہائی ہوئی۔ اب حیران تھا کہ کہاں جاؤں۔ ایک شامی عرب سے جن کا نام عبدالفتاح تھا کشتی میں تعارف ہو گیا تھا۔ میں نے اُن سے اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ آپ مجھ کو کوئی معقول طریقہ بتائیں انھوں نے کہا کہ میری حالت بھی تمہارے قریب قریب ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ دونوں ساتھ رہیں۔ یہ طریقہ اگرچہ احتیاط کے خلاف تھا لیکن ناواقفیت اور اجنبیت زبان کی وجہ سے مجبوراً اختیار کرنا پڑا۔ اور سچ پوچھئے تو یہی اتفاقی معیت میری تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی۔

یہاں مسافروں کے ٹھہرنے کے چند طریقے ہیں سب سے زیادہ اطمینان اور آرام تو ہوٹلوں میں ہے لیکن اوّل تو اُن کا کرایہ ایک پونڈ (بائیس روپے) روزانہ سے کم نہیں۔ دوسرے اکثر بلکہ قریباً تمام عمدہ ہوٹل یورپین آبادی میں ہیں جو اسٹنبول سے دور ہے اور جامع مسجدیں، کتب خانہ، مدرسے اور مکاتب جس قدر ہیں سب اسٹنبول میں ہیں۔

ہوٹل کے بعد خانات یعنی سرائیں ہیں لیکن یہ سرائیں ہندوستان سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں یہاں بڑی بڑی سراؤں میں جس قدر کمرے ہوتے ہیں عموماً وسیع اور پُر فضا ہوتے ہیں اور ان میں ہر وقت نواڑ کا پلنگ توشک۔ چادر لحاف اور ضروری چیزیں مہیا رہتی ہیں ایک ایک کمرے میں کئی کئی پلنگ ہوتے ہیں اور فی پلنگ آٹھ آنہ کرایہ ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ کرایہ کے مکانات ہیں۔ یہ مکانات اکثر دو منزلہ سہ منزلہ ہوتے ہیں۔ ہر درجے میں متعدد کمرے اور ہر کمرے میں میز کرسی۔ کوچ لمپ۔ فرش۔ پلنگ۔ توشک۔ تکیہ۔ لحاف مہیا رہتا ہے۔ کرایہ فی کمرہ دس روپیہ ماہوار سے بیس تیس تک ہوتا ہے۔ ان مکانوں کے مالک یا اجارہ دار عموماً عیسائی ہیں۔ وہ خود بھی انھیں مکانوں میں رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے مسافروں کو کچھ کم آرام ملتا ہے۔

اگرچہ جیسا میں نے ابھی بیان کیا کرایہ کا مکان لینا زیادہ آرام دہ طریقہ تھا لیکن میں اور میرے شامی دوست اس طریقہ سے ناواقف تھے اس لئے ایک خان یعنی سرائے میں جا کر ٹھہرے اس انتظام کی طرف سے مطمئن ہوا تو جہاز پر جا کر اپنا اسباب اٹھوا لایا۔ چھ سات دن تک ہم اس خان میں رہے پھر باب عالی کے پاس ایک عمدہ مکان کرایہ پر لے لیا۔

خوش قسمتی سے شیخ عبدالفتاح جن کے ساتھ میں نے زبردستی دوستی پیدا کی تھی بڑے معزز خاندان کے آدمی نکلے۔ دمشق میں حضرت خالد نقشبندی ایک بزرگ گزرے ہیں جن کے ساتھ یہاں کے لوگوں کو اس قدر

ارادت ہے کہ اُن کا نام نہیں لیتے۔ بلکہ حضرت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بزرگ ہمارے خاک ہندوستان کے تربیت یافتہ یعنی حضرت مرزا جان جانان دہلوی کے مرید تھے۔ شیخ عبدالفتاح انھیں کے بھتیجے ہیں اور اس تعلق سے لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ چونکہ قسطنطنیہ میں شامیوں کا ایک بڑا گروہ ہے۔ وہی چار روز میں شیخ عبدالفتاح کی اکثر لوگوں سے شناسائی ہو گئی اور اُن کے ذریعہ سے مجھ کو بھی ان لوگوں سے تعارف ہوتا گیا۔

ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں، شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے میں بھی اس وقت موجود تھا اور اتفاق سے رسالہ اسکات المعتدی جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے سامنے رکھا ہوا تھا انھوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا اہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا اور انھوں نے اُس کے مصنف کی نسبت کہا تھا شکر اللہ مساعیہ۔ شیخ علی ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اُٹھ کر بڑی گرمجوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے مجھ کو اس بات سے کہ میری تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہ قبول سے دیکھا نہایت مسرت ہوئی اور سفر کی کس مپرسی میں اتنا ذریعہ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔ شیخ علی ظبیان نوجوان آدمی ہیں فقہ کی تحصیل شیخ عبدالرحمن سے کی ہے جو مصنف رد المختار (مشہور بہ شامی) کے نواسے اور شاگرد تھے اگرچہ ان کو اکثر علوم متداولہ میں دخل

ہے لیکن ادب میں زیادہ مہارت ہے ایک غیر منقوطہ قصیدہ سلطان کی مدح میں پیش کیا تھا۔ جس پر ان کو صلہ و انعام بھی عطا ہوا۔ مدت سے درویش پاشا کے مہمان ہیں اور پاشائے موصوف ان کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ رکھتے ہیں مجھ سے ان کا تعلق روز بروز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ باوجود بُعد مسافت قریباً ہر روز میرے مکان پر تشریف لاتے اور کبھی کبھی تمام دن میرے پاس رہتے۔ شیخ عبد الفتاح چند روز کے بعد دمشق چلے گئے۔ اس وقت تنہائی میں شاید تکلیف پہنچتی لیکن شیخ علی ظبیان کی غمگساریوں نے تمام ترددات دل سے دور کر دئے۔ مکان جو ہم نے کرایہ پر لیا تھا اگرچہ نہایت خوش فضا اور موزوں تھا۔ لیکن چونکہ مکان کا مالک، (عارضی) نہایت بدمعاملہ اور آوارہ مزاج تھا چند روز کے بعد میں نے دوسرا مکان کرایہ پر لیا اور تا آخر وہیں رہا۔ یہاں مکان کی خوبی کے ساتھ بڑا آرام یہ تھا کہ مالک مکان ایک نیک مزاج عورت تھی اگرچہ اس کا مذہب عیسائی اور قوم اٹالین تھی تاہم بقدر ضرورت عربی بول لیتی تھی اور مسلمانوں سے ایک خاص اُنس رکھتی تھی۔

کھانے پینے کے انتظام کی ہم کو کچھ ضرورت نہ تھی ہوٹل اور دوکانیں کثرت سے ہیں اور نہایت مرتب اور پر تکلف ہیں بازار میں کھانا یہاں مطلق عیب نہیں میں نے اکثر معزز عہدہ داروں کو ہوٹلوں میں کھاتے دیکھا۔ یہ ہوٹل عموماً عیسائیوں کے ہیں مسلمانوں کی دوکانیں بجز اس کے کہ میز کرسی وہاں بھی ہوتی ہے باقی اور باتوں میں ہندوستان کی دوکانوں سے مشابہ ہیں۔

عبدالحلیم شرر

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے
اُن کے نانا واجد علی شاہ آخری فرماں روائے اودھ کی ملازمت
میں تھے اور سلطنت کی ضبطی کے بعد نواب صاحب موصوف کی طرف
سے مقدمہ کی پیروی کرنے ولایت بھیجے گئے تھے۔ اُن کے والد حکیم
سید تفضل حسین صاحب بھی مٹیا برج میں نواب صاحب کے رفیق تھے
شرر کی ولادت ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں ہوئی اور بچپن کے کئی سال
یہاں گذارے۔ مکتب میں کئی سال گذرنے کے بعد یہ اپنے والد کے
پاس مٹیا برج چلے گئے۔ لکھنؤ کے اُجڑنے کے بعد یہاں کی رونق
مٹیا برج میں ہی منتقل ہو گئی تھی اور نواب صاحب کی مجلس میں
ہر علم کے ماہر اور ہر فن کے کامل لوگ موجود رہتے تھے۔ شرر نے
انھیں سب کی صحبت میں پرورش پائی، لیکن چند سال بعد ۱۸۷۰ء
میں یہ پھر لکھنؤ چلے آئے۔

لکھنؤ آکر شرر نے تعلیم کی طرف باقاعدہ توجہ کی ۱۸۷۵ء میں اسی
مقصد سے دہلی کا سفر بھی اختیار کیا، اسی دورہ میں سر سید سے بھی
ملاقات ہوئی۔ دہلی میں مولانا نے محمد بن الوہاب نجدی کے ایک

مذہبی رسالہ توحید کو اُردو میں ترجمہ کیا۔ یہ شرر کی پہلی تصنیف ہے۔

اس زمانہ میں لکھنؤ میں اودھ اخبار لکھنؤ کی ادبی مجلسوں میں بہت مقبول تھا، شرر ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ واپس آئے اور اودھ اخبار کے مضمون نگاروں میں شامل ہو گئے ۱۸۸۷ء میں اخباری دنیا کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے خود اپنا ایک رسالہ دلگداز کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اسی رسالہ میں اُن کے کئی ناول مثلاً ملک العزیز ورجنیا حسن الجلینا، منصور موہنا وغیرہ شائع ہوئے۔ اس کے بعد شرر حیدرآباد گئے جہاں سے ۱۸۹۲ء میں انھوں نے نواب وقارالامرا کے صاحبزادے کے ساتھ ولایت کا سفر اختیار کیا اور اس طرح انگریزی اور فرانسیسی زبان سے عمدہ واقفیت بہم پہنچائی۔ تاریخ سندھ ان کی تصنیف حیدرآباد کے قیام کی یادگار ہے۔ ولایت سے واپس آکر شرر نے چند سال حیدرآباد میں قیام کیا اور ۱۹۰۹ء میں وہاں سے ترک تعلق کر کے لکھنؤ چلے آئے جہاں دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا عبدالحلیم شرر کو تاریخ اور ناول کے فن سے بڑی دلچسپی تھی اس لئے انھوں نے تاریخی ناول لکھنے کا آغاز کیا۔ اُن کے یہ تاریخی ناول اپنی قسم کے اُردو میں پہلے ناول ہیں۔ اس سے اُردو ناول کی تاریخ میں ترقی کی ایک نئی شاہراہ کھل گئی۔ بجائے فرضی قصوں اور خیالی داستانوں کے جن کا پہلے زیادہ رواج تھا اب ایسے ناول پسند کئے جانے لگے جن میں واقعات کی صحت پلاٹ اور کردار کا

خیال رکھا گیا ہو۔ ناولوں کے علاوہ اُن کے مضامین بھی اردو ادب کے اعلیٰ نمونوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بالخصوص اُن کا تاریخی مضمون "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" بہت اچھا ہے جس میں لکھنؤ کی تاریخ اور وہاں کی خاص تہذیب و معاشرت کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے اُنھوں نے شاعری کی طرف بھی توجہ کی اور وہ اُن چند بزرگوں میں ہیں جنھوں نے پہلے اُردو میں انگریزی طرز پر غیر مقفیٰ اور آزاد نظمیں لکھیں۔

اُن کا طرز بیان نہایت سلجھا ہوا اور رواں ہے۔ منظر نگاری میں وہ ایک کامیاب مصوّر کی طرح ہر نقش و نگار کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ دقیق الفاظ اُن کے یہاں بالکل نہیں ملتے، اسی وجہ سے ان کی عبارت شگفتہ اور رواں نظر آتی ہے۔

ٹوٹا ہوا کھنڈر

ہماری نظریں جس شوق سے ایک ٹوٹے ہوئے تارے کے ساتھ دوڑتی ہیں اس طرح ان آہستہ خرامی کی ادا دکھانے والے شاہدانِ فلک یعنی تاروں میں سے کسی ایک کے بھی چہرۂ زیبا کی طرف نہیں دوڑتیں چاند اور سورج کے گورے اور روشن چہرے روز ہی اپنی آب و تاب اور اپنے حسن کی بہار دکھایا کرتے ہیں مگر ہم نے انھیں اس توجہ و مصروفیت سے کبھی نہیں دیکھا جیسے کہ اس روز دیکھتے ہیں جب یہ گہنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اُن کے مٹے ہوئے حُسن۔ بگڑے ہوئے بناؤ اور اُن کے ماند چہروں پر ایک حسرت برستی ہوتی ہے۔

بعینہٖ اسی طرح جس متاثر دل اور محویت کی نگاہ سے ہم کسی ٹوٹے ہوئے کھنڈر۔ منہدم قلعے۔ اور شکستہ ایوان کو دیکھتے ہیں آباد محلوں باشان و شوکت قصروں اور بارونق ایوانوں کو ہرگز نہیں دیکھتے دنیا کے مشہور و معروف شہروں میں جاتے۔ ان کی عالی شان عمارتوں کی سیر کرتے۔ اور اُن کے خوشنما محلوں اور سر بہ فلک قصروں کے پاس سے ہو کر گذرتے ہیں۔ لیکن اُن میں ہمیں کبھی کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ خواہ مخواہ ٹھہرنا پڑے اور انھیں غور و دلچسپی سے دیکھنے پر

مجبور ہو جائیں۔ مگر اس کے مقابل جب ہمارا گذر اُن پرانے شکستہ
محلوں۔ افتادہ ایوانوں اور منہدم قلعوں کے پاس سے ہوتا ہے
تو حسرت پُر درد آواز سے ہمیں پکارتی۔ عبرت چونکاتی۔ اور بے کسی
ہمارا دامن پکڑ لیتی ہے اور ہزار عجلت ہو مگر ہمارا قدم رُک ہی جاتا
ہے کسی زبردست کشش سے مجبور ہو کر ہم وہاں کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ نظر اٹھاتے ہی عبرت کی ایک تصویر ہمارے پیش نظر ہو جاتی
ہے۔ اور ہم داستان حسرت کو سننے لگتے ہیں جسے وہ اپنی خاموش
زبان سے سناتے اور اپنی متانت کے چشم وابرو سے اُس میں اثر
پیدا کرتے ہیں۔

اے دنیا کے آباد اور بارونق محلو! تم میں چاہے کیسے ہی دولت
کے کرشمے اور جاہ و ثروت کے نمونے ہوں مگر وہ کشش اور دلچسپی ہرگز
نہیں جو ان شکستہ عمارتوں اور منہدم آثار سلف بلکہ گری پڑی اینٹوں میں
ہے، تمہیں ندامت کی ان عبرت خیز یادگاروں پر رشک آتا ہوگا۔ اور
بیشک آنا چاہیے۔ تم چند روزہ دولت کے نشے میں اس قدر چور ہو گئے
نہ تم میں ایسے سچے جذبات ہیں اور نہ تمہاری حس اس قدر صاحب ہے
تم میں یہ مادّہ ہی نہیں۔ تاکہ دوسروں کے انجام سے اپنی ہستی موہوم
کے متعلق کوئی سبق حاصل کرو۔

دیکھو! ان عالیشان آباد اور بارونق قصروں میں ہر قسم کی دھوم
دھام ہے۔ ان کا عروج عنفوانِ شباب کے مزے لے رہا ہے ان میں

ہر طرح کی دلچسپیوں کے سامان ہیں۔ شان و شوکت ہے۔ دولت و حشمت ہے مگر ان سب چیزوں میں طفلانہ مزاجی کی بو آ رہی ہے۔ سب کچھ ہے لیکن ایک فلسفی اور عالی خیال حکیم کے مذاق کی دلچسپیاں نہیں ہیں۔

اے فخر و ناز سے سر اٹھانے والے ایوان! تجھ میں چہل پہل ہے۔ شور و ہنگامہ ہے۔ آنے جانے والے بھیڑ لگائے ہوئے ہیں۔ ایک میلا سا لگا ہوا ہے۔ دولت کے کرشمے ہیں۔ امارت کی خود پرستیاں ہیں اور اس دولت پر جو خدا کی سب سے بڑی رحمت و نعمت ہے ہر قسم کے ظلم ہو رہے ہیں۔ تجھ میں غرور ہے اور خود ستائی ہے۔ ناعاقبت اندیشی ہے اور نشہ بادہ نخوت ہے۔ جو لوگ تیرے سامنے کھڑے ہوئے چلا چلا کے دعائیں دے رہے ہیں اُن میں طلبیی اور جس قدر خوشامد و چاپلوسی ہے اُس سے زیادہ اور بدرجہا زیادہ اُن لوگوں کی بے زبانی کی بددعاؤں میں اثر ہے جو تیرے ستائے ہوئے ہیں اور تیرے قدموں کے پاس خاموش کھڑے ہیں۔

افسوس تو اپنی شانداری و خوشنمائی پر نازاں ہو کے منہدم محلوں اور سرنگوں ایوانوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا اور اپنی موجودہ رونق پر اترا یا جاتا ہے۔ مگر یہ نہیں دیکھتا کہ تیرے دامن میں کیسے کیسے دھبے ہیں اور تیرا آغوش کس قدر ناپاک ہے۔ تجھ میں دنیا بھر کی بداخلاقیاں اور ہر قسم کی سیہ کاریاں ہیں۔ تجھ میں عیش پرستیاں اور ناعاقبت اندیشیاں ہیں۔ تجھ میں انتہا درجہ کی غفلت ہے اور نہایت ہی خطرناک نکبت۔ تجھ میں حقیقت و اصلیت کا نام و نشان نہیں بلکہ جو کچھ ہے نمائش اور بناوٹ

ہے۔ تیرے خوبصورت دروازوں پر پرتکلف اور نظر فریب پردے
پڑے ہوئے ہیں مگر وہ پردے ان سے زیادہ موٹے اور سنگین ہیں
جو تیرے مکینوں کی آنکھوں پر پڑے ہوئے ہیں تجھ میں وہی لوگ آتے ہیں
جو تیرے اصلی دشمن ہیں اور وہ لوگ تجھ سے دور ہی دور بھاگتے ہیں
جو تیری خرابیوں۔ تیرے نقصانوں اور تیری نکتوں کو بخوبی سمجھ گئے
ہیں اور جو تیرے حقیقی دوست ہیں۔ ہمیں صاف نظر آرہا ہے کہ تو نے
اپنے بدخواہوں اور دشمنوں کو گود میں بٹھا لیا ہے۔ اور دوستوں اور
خیر اندیشوں پر اپنا دروازہ بند کر دیا ہے۔ افسوس! نہ اپنے سچے دوستوں
کے لئے تیرے آغوش میں جگہ ہے اور نہ تیرے مکینوں میں اُن کی قدر
کرنے کی لیاقت ہے۔ آہ! تو وہ شکرین گیا ہے جس پر مکڑیں بیتابی اور
فریفتگی سے دوڑ دوڑ کے گرتی ہیں۔ جو کسی دن تیرے مکینوں ہی کے
ڈنک ماریں گی۔

تیرے سامنے نوکروں چاکروں کا ہجوم ہے۔ چوبدار اور شاگرد پیشہ
دوڑ رہے ہیں۔ نوبت بج رہی ہے۔ اور طرح طرح کے نغمے سنے جا رہے
ہیں۔ شان و شوکت کے اظہار اور دولتمندی کا ٹھاٹھ دکھانے کے
لئے بہت سا جلوس جمع ہے۔ مگر افسوس کہیں یہ وہ جلوس نہ ہو جو مردے
کو آخری دھوم دھام کے ساتھ قبر کی طرف لے جاتا ہے۔

اے بدکاریوں کے گھر اور اے شہوت پرستیوں کے نشیمن۔ تیری
ظاہری نمائش چاہے کیسی ہی نظر فریب ہو اور تو اپنے دکھاوے کی باتوں

سے چاہے کیسا ہی دھوکا دیتا ہو مگر تیرا باطنی رُخ اس قدر تیرہ و تار ہے کہ تو وہ کاجل کی کوٹھری بنا ہوا ہے جس میں اگر کوئی ایک گھڑی کو بھی آجاتا ہے تو اس کے دامن میں دھبہ ضرور لگ جاتا ہے۔

تیرے مکینوں نے صفحاتِ تاریخ کو کبھی عاقبت اندیشی کی نظر سے دیکھا ہوتا تو انھیں نظر آتا کہ ان شکستہ و منہدم ایوانوں میں جو انقلابِ زمانہ کی مار کھا کے اور بیوفائی روزگار کا تجربہ اُٹھا کے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے ہیں۔ کبھی تجھ سے زیادہ شان و شوکت اور دھوم دھام تھی۔ اُن کی سطوت اور اُن کا جبروت تیرے رعب داب سے کہیں زیادہ بڑھا چڑھا تھا۔ جو قوت اور جیسی حکومت ان ٹوٹے کھنڈر والوں کو حاصل تھی تیرے مکینوں کو ہرگز نہ نصیب ہو گی۔ اس لئے کہ اب پبلک کی قوت امارت و شاہی کی قوت سے بڑھ گئی اور روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ نہ اب ویسے بادشاہ پیدا ہوں گے اور نہ ویسے امرا و رؤسا۔ مگر انھیں بھی زمانے نے تیرے مکینوں کی طرح دھوکا دیا۔ وہ غلط فہمی سے یہ سمجھ گئے کہ دنیا کا ہمیشہ یہی رنگ رہے گا اور اسی غلطی و ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے کہ اُن کا قصر و ایوان آج اس حالت میں پڑے ہیں کہ دوسروں کے لئے سرمایۂ عبرت اور تیرے لئے آئندہ قسمت کی تصویریں ہیں۔ اور قدرت نے اُن کے بگڑے ہوئے حسن۔ اُن کی حسرت و یاس۔ اُن کی عبرتناک صورت اور اُن کی خاموش زبان میں وہ درد اور اثر پیدا کر دیا ہے کہ جس کشش سے وہ ہمارے دلوں

کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو نہیں کھینچ سکتا۔

اے سراپا عروج عالیشان قصر جس میں طفلانہ مزاجیوں کے سوا کچھ نہیں ہے تو ایک گھڑی کے لئے اپنی اقبال مندی پر ناز کرتے اور اپنی خود پرستی و خود نمائی کو چھوڑ کے ذرا یہ تو دیکھ کہ اُس ٹوٹے پھوٹے کھنڈر میں کیا کیا باتیں ہیں جو تجھ سے دور ایک نہایت ہی خاموش اور سنسان مقام میں کھڑا ہے اور اپنی زبانِ حال سے عجب حسرت و درد کے لہجے میں قدامت کی داستانیں سُنا رہا ہے۔

وہ تاریخ کا ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ ورق ہے۔ کسی اگلی بزم طرب اور گذشتہ صحبت عیش کے گل ہونے کے قریب پہنچی ہوئی شمع ہے۔ اس کے نقش و نگار کسی گذرے اور مٹے حسن کے بگڑے ہوئے خط و خال ہیں۔ اس کے شکستہ اور گرے ہوئے کنگرے وہ سر ہیں جنھیں سرکشی کے جرم میں زمانے کے بے رحم ہاتھ نے مار مار کے زبردستی اپنے آگے زمین پر جھکا دیا۔ وہ مجسم کتاب نصیحت اور مرقع عبرت ہو رہا ہے۔ اُن سرکشوں کی سرگذشت سناتا ہے جو اپنے سامنے کسی کی ہستی نہ سمجھتے تھے۔ اور آخر قدرت کے دربار سے سزایاب ہوئے۔ اُن حقیقت شناسوں کو یاد دلاتا ہے جو دنیا کی بے ثباتی دیکھ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ نمائش اور خود پرستی کے سارے سامان اُس سے چھین لئے گئے اور اب جو کچھ رہ گیا وہ صرف حقیقت و اصلیت ہے۔ اب اُس میں نہ وہ چند روزہ دولت کا غرور ہے اور نہ وہ امارت

کی بدمستی و خود فراموشی نہ مستعار جاہ و حشمت کی نیرنگیاں ہیں اور نہ غیر پائدار شان و شوکت کی خود پرستیاں۔

اے پرانے ایوان کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر! تجھ میں ایک صاحب باطن صوفی صافی کی ایسی سادہ مزاجی ہی نہیں بلکہ محویت و از خود رفتگی بھی ہے۔ دنیا ہر پرانی چیز کو ایک متبرک اور درد دلین کی یادگار سمجھ کے ادب و عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اسی خیال سے اب وہ تیرا ادب بھی کرنے لگی ہے۔ اور جس طرح دنیا پرست لوگ کسی تارک الدنیا مردِ خدا کی زیارت کے لئے بڑے شوق سے جاتے ہیں۔ اسی طرح اب تیری زیارت کے لئے بھی ہر ملک کے قافلہ روانہ ہونے لگے ہیں۔ مصر میں جا کے وہ ممفس اور تھیبس کے سنسان ویرانوں میں کھڑے ہوتے ہیں اور تجھے ایک عقیدت کیش کی طرح نہایت ادب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شام میں وہ بعلبک اور پالمیرا کے گرے پڑے پتھروں پر کھڑے ہو کے تیرا دلکش جلوہ دیکھتے ہیں اور تیرے کائی بھرے دامن کو کسی کے متبرک دامن کی طرح آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ بغداد و موصل کے قریب وہ بابل و نینوا کے افتادہ در و دیوار میں ایک ہیبت بھرے دل سے آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے جاتے ہیں اور خلوص دل و عقیدت کیشی سے تیرے قدم چومتے ہیں! ایلورا اور ایجنٹا کے پہاڑوں میں کھدے ہوئے پرہیبت و عظمت مقاموں میں وہ تیرا ادب کرتے ہوئے قدم رکھتے ہیں اور دہلی مرحوم کی پر

حسرت افتادہ عمارتوں میں اب تیرے لئے جن آداب کا وہ لحاظ رکھتے ہیں شاید شاہی کے اُس رعب داب کے زمانے میں نہ رکھتے ہوں گے بہرحال جہاں جہاں تیرا جلوہ نظر آرہا ہے وہاں اگرچہ حسرت ہی حسرت برس رہی ہے۔ اور سوا سنسان منظر بھیانک محرابوں اور خاموش و پا شکستہ ستونوں کے کچھ نہیں ہے۔ مگر ہر طرف کے قافلوں کا رُخ زیادہ تر تیری ہی طرف پھر گیا ہے۔ اس لئے کہ جیسا اچھا سبق تیری خاموش صحبت اور تیری پُرجلال متانت انھیں دیتی ہے ویسا نہ کسی مدرسے میں مل سکتا ہے اور نہ کسی صحبت وعظ میں اور کیوں کر نہ ہو۔ جس طرح جوانی کی بے اعتدالیوں سے بڑھاپے میں متنبہ ہو کے کوئی باخدا اور نیک نفس و پاک باطن ہو جاتا ہے اُسی طرح اے اگلے زمانے کے منہدم ایوان! تو بھی ساری نمائشوں کل اخلاقی برائیوں اور سارے عیوب کو دور کر کے پاک صاف اور پاک باطن ہو گیا ہے۔ اگلی سیاکاریوں کے دھبے تیرے دامن سے دُھل گئے۔ اور اب تیرا دروازہ اُن بداخلاقیوں کے لئے کبھی نہ کھلے گا۔ وہ پُرانی بدمستیاں اور خودپرستیاں تجھ سے دور ہو گئیں۔ اور اب پھر وہ بے حیائی و بے شرمی کی صحبتیں تجھ میں کبھی نہ ہوں گی۔ اب تیرا سکوت اُن حقیقت شناسوں کو یاد دلاتا ہے جو دنیا کی بے ثباتی دیکھ کے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے! اور تیری تنہائی اور سنسان حالت اُن پاکبازوں اور مرتاض ولیوں کی مصونا

صورت دکھاتی ہے، جنھوں نے دنیا کے ہر رنگ کو پھیکا اور بے مزہ دیکھ کے ترک لذات کر دیا ہے۔

اب تجھ میں وہ بدکار رئیس کبھی نہ آئیں گے جو عیش پرستی کے وقت دنیا و مافیہا در کنار خدا کو بھی بھول جاتے تھے۔ اور اُن کی بدکاری کی صحبتوں کا سماں اب کبھی تیری ٹوٹی پھوٹی محرابوں اور شکستہ چھتوں کے نیچے نہ نظر آئے گا۔ وہ تجھ میں اب قدم بھی رکھیں گے تو خدا سے ڈرتے ہوئے اور اپنے انجام کی ہولناک تصویر دیکھ دیکھ کے سہمتے اور کانپتے ہوئے۔ اب جس مخلوق نے تجھے اپنا نشیمن قرار دیا ہے وہ بھی دنیا سے ویسا ہی متنفر ہے جیسا کہ تو ہے۔ ابابیلیں تیری گری پڑی چھتوں میں اپنی مسافروں کی سی رات کاٹتی ہیں۔ چمگادڑ دن کے فتنوں سے بچنے کے لئے تیرے دامن میں آ کے پناہ لیتی ہیں اور اُس وقت تجھے چھوڑتی ہیں جب دنیا کی ہر برائی و بدکاری پر رات آ کے اپنا پردہ ڈال دیتی ہے۔ اُلّو نے تجھے اپنی شب بیداری کی خانقاہ بنایا ہے۔ جہاں وہ گویا سارے عالم سے الگ ہو کے ضربیں لگاتا اور اُس خدا کو یاد کرتا ہے جس کی عظمت و جلال کا جلوہ تیرے سناٹے میں سب جگہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

علامہ راشد الخیری

راشد الخیری صاحب ۱۸۶۸ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ان کا اصلی نام عبدالرشید تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ ابوالخیر خیراللہ صاحب نے شاہجہاں کے زمانہ میں دلی میں آکر بود و باش اختیار کر لی تھی اسی مناسبت سے وہ اپنے نام کے آگے خیری لکھنے لگے۔ فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کر کے عربی کالج دہلی میں داخل ہوئے ایس۔ ال۔ سی کا امتحان وہاں سے پاس کر کے محکمہ بندوبست میں عرصہ تک ملازم رہے۔

آپ کو شروع ہی سے مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی تھی۔ مگر بندوبست کے محکمہ میں رہ کر تصنیف کا کام کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر بھی دوران ملازمت میں آپ نے منازل السائرہ لڑکیوں اور عورتوں کی اصلاح کے لئے لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ پھر ۱۹۰۵ء میں آپ نے ماہانہ رسالہ عصمت جاری کیا جو آج تک آپ کی وفات کے بعد بھی جاری ہے ۱۹۱۰ء میں آپ نے ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنی زندگی مستقل طور پر تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دی۔ اور نہ صرف اپنا سارا زور قلم عورتوں کی جہالت اور توہم پرستی دور کرنے ان کے حقوق کی حمایت میں ان کی ذہنی اور معاشرتی اصلاح میں صرف کیا بلکہ بہت بڑی حد تک مردوں کو ان کی حالت زار پر رحم دلانے کی طرف متوجہ کیا لڑکیوں اور عورتوں کی اصلاح کی طرف جو دلچسپی آپ کو شروع

سے بھی وہ تمام عمر قایم رہی۔ سرسٹھ سال کی عمر میں فروری ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

راشد الخیری صاحب ایک صاحب طرز مصنف اور ایک کہنہ مشق انشاپرداز ہیں آپ کا طرز نگارش مخصوص ہے اس کی نقل آج تک کوئی نہیں اتار سکا شیریں ملائم الفاظ اور سادہ اور شگفتہ زبان لہجہ میں کوٹ کوٹ کر اثر بھرا ہوا ہوتا ہے آپ کی زبان خاص دہلی کی اُردوئے معلیٰ ہے ڈاکٹر نذیر احمد (جو ان کے حقیقی پھوپا اور استاد تھے) کے طرز سے بھی آپ بہت متاثر ہوئے اور انھیں کی طرح تعلیم نسواں آپ نے بھی اپنے لئے لازم کر لیا۔ بیگمات کی زبان و محاورہ پر آپ کو پورا پورا عبور حاصل ہے۔ آپ کا عام لہجہ حزنیہ ہوتا ہے سوز و گداز آپ کی تحریر کی ایک نمایاں خصوصیت ہے آپ کی کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جسے پڑھ کر کوئی سخت سے سخت دل والا بھی اپنے آنسو ضبط کر لے اسی خصوصیت کی بنا پر آپ کو مصوّرِ غم کا خطاب دیا گیا۔

آپ نے ناول اور مذہبی واقعات بکثرت لکھے ہیں ناولوں میں صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، نوحہ زندگی ہیں اور مذہبی کتابوں میں آمنہ کا لال۔ گدڑی کا لال وغیرہ بہت مشہور اور مقبول کتابیں ہیں لیکن بہ اعتبار فن کے ان کے ناول مکمل نہیں ہیں گو اسلوب بیان صاف سلیس اور بے انتہا موثر ہے کہیں خطیبانہ انداز ہے کہیں شاعرانہ رنگینی۔ لطیف تشبیہات بھی ہیں اور نازک استعارات بھی لیکن کردار نگاری ان سے اچھی طرح نبھ نہ سکی۔ مکالمے بھی کمزور ہیں تاہم تاثیر سے ان کی کوئی تحریر خالی نہیں ہے۔

کتاب شہادت کا ایک ورق

اس دردِ اسلام کا پہلا دورہ جس کی کسک آج تک مسلمانوں کے دل میں موجود ہے۔ اور یہی مسلم بن عقیل کی شہادت سے شروع ہوتا ہے۔ جو امام کے چچا زاد بھائی تھے۔ جو مع اپنے دو خورد سال بچوں کے امام کے حکم سے کوفیوں کی متواتر درخواستوں پر روانہ ہوئے۔ بظاہر کوفیوں نے بہت بڑے پیمانہ پر اپنے مہمانوں کے استقبال کی تیاریاں کیں لیکن ابن زیاد کی ایک ہی بھبکی میں جو وہاں کا عامل تھا۔ تتّر بتّر ہو گئے۔ تا آنکہ اس کم بخت نے سرزمین کوفہ کے اس مہمان کو جو بے یار و مددگار تھا۔ اپنے حکم سے شہید کر دیا۔ اور ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ مسلم کے دونوں بچے محمد اور ابراہیم کوفے میں موجود ہیں۔ جو شخص ان بچوں کو لائیگا۔ مالا مال کر دوں گا۔ اور اگر کسی نے ان کو پناہ دی۔ تو زن بچہ کو کولھو میں پلوا دوں گا۔

قاضی شریح جس کا گھر ان دو یتیم ولاوارث مہمانوں سے منوّر تھا۔ عاشق رسول تھے۔ مگر ابن زیاد کے حکم سے پریشان ہو گئے۔ دونوں بچوں کو کلیجے سے لگا لیا اور آدھی رات کے وقت ان کو تھوڑا سا کھانا دے کر اپنے گھر

سے رخصت لے کے قادسیہ کی سڑک پر چھوڑ دیا کہ سیدھے مدینے چلے جاؤ۔ رات اندھیری تھی۔ اور جنگل خوفناک۔ چھ اور آٹھ برس کے دو بچے جن کے پاؤں لہولہان ہو گئے تھے۔ رستہ چل رہے تھے۔ ننھا سا دل سہم رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب ظالم ہم کو پکڑنے آرہے ہیں۔ تھک کر بیٹھتے تھے۔ ڈر کر اٹھتے تھے۔ اور گھبرا کر بھاگتے تھے۔ رستہ بھول گئے اور مدینے کے معصوم مسافر بھولے بھٹکے کوفے سے آگے نہ بڑھ سکے۔

یہاں تک کہ رات نے بد نصیبوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور شبنم صبح نے بے کسوں کی حالت پر آنسو بہائے۔ پو پھٹتے ہی دونوں کے سینے دھکڑ دھکڑ کرنے لگے۔ حسرت سے ایک نے دوسرے کی صورت دیکھی اور یقین ہو گیا کہ آج کا آفتاب ہمارے واسطے پیغام موت لے آیا۔ دشمن چاروں طرف تلاش میں پھر رہے تھے۔ آسمان و زمین یہاں تک کہ پاؤں تلے کی چیونٹی بھی خون کی پیاسی تھی۔ کیسا نازک وقت تھا۔ خاندان اہلبیت کے دو پھولوں کی تلاش میں اسی خاندان کا کلمہ پڑھنے والا حاکم اس کی پوری کمک فوج اور شہر کی تمام آبادی جس نے مہمان نوازی کا وعدہ کیا تھا۔ جان کے درپے تھے۔

چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مگر کوئی اللہ کا بندہ ایسا نظر نہ آیا کہ بن باپ کے بچوں کو پناہ دے دیتا۔ اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ آسمان دور تھا۔ زمین پر نظر ڈالی۔ سخت تھی۔ سہمے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے۔ دل ہوا ہو رہا تھا۔ اور موت کی تصویر ہر طرف سے نظر آرہی تھی۔ دریا آنکھوں کے سامنے لہریں لے رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک درخت

دکھائی دیا۔ حالت مایوسی میں اُس طرف لپکے اور ایک تنے کی کھوہ میں
دونوں چھپ گئے کہ دن بسر ہو جائے تو رات کو نکل کھڑے ہوں گے۔

چڑیوں کے چہچہے ختم ہو گئے ہوا کی رفتار مدھم ہوئی اور آفتاب نے اپنی نظریں یتیمانِ عقیل پر ڈالیں کہ طوعہ نامی ایک عورت پانی کی تلاش میں کنارِ دریا پر آئی۔ ڈول ڈالنا چاہتی تھی کہ سطحِ آب پر کھلے ہوئے دو پھول نظر آئے اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھتی ہے تو دو بچے لپٹے ہوئے بیٹھے ہیں سمجھ گئی۔ اور معصوموں کی حالت پر کلیجہ کٹ گیا۔ کہنے لگی۔

"مسلم کے بچو اترو۔ میرے گلے سے لگ جاؤ" لرز گئے۔ چھپنے کی کوشش کی جگہ نہ تھی۔ نیچے اُترے۔ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ زبانیں خاموش اور صورت تصویر تھی۔ طوعہ نے کلیجے سے لگایا اور کہا۔

"آؤ میرے گھر چلو۔ بے اولادی ہوں۔ میرا دل ٹھنڈا کرو۔ مسلمان ہوں میرا گھر روشن کرو۔ عاشقِ رسول ہوں میری عزت بڑھاؤ۔ میرے پیارو سمجھو نہیں۔ ڈرو مت دشمن نہیں۔ لونڈی ہوں۔ اِن کملائے ہوئے چہروں کی عاشق۔ اِن بھولی صورتوں کی شیدا۔ تمہارے پاؤں میرے سر پر ہوں گے۔ اور تمہارے قدم میری آنکھوں پر۔ دل میں رکھوں گی۔ آنکھوں میں چھپاؤں گی۔"

چھوٹے کو گود میں لیا۔ بڑے کی انگلی پکڑی۔ باپ کی مفارقت اپنی غربت دونوں خاموش تھے۔ طوعہ گھر لے گئی۔ کنیز تھی۔ بی بی سے کہا۔ ساقیِ کوثر کی جان یہ بے زبان تیرے مہمان ہیں۔ اور دیکھ مسلم شہید کے بچے تیری پناہ میں آئے ہیں۔ غربت ان کی صورتوں پر حسرت ان کے چہروں پر اور بےبسی

ان کی عمروں پر برس رہی ہے۔ یہ دیکھنے میں بے بس ہوں۔ مگر جنت کے مالک ہیں۔ معصوم ٹکٹکی باندھے بی بی کی صورت دیکھ رہے تھے۔ آگے بڑھی سر پر ہاتھ پھیرا اور لپٹ گئی۔ رو کر کہا "مہمان نہیں۔ میرے سر تاج ہو۔ ان قدموں پر جان اور ان چاند سے مکھڑوں پر زندگی نثار کروں گی"۔

نہلا دھلا کر کپڑے بدلے اور کھانا پکا کر آگے رکھا۔ چاہتے تھے کہ کھائیں۔ مگر باپ کی موت یاد آ گئی۔ معصوم آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ طوعہ اور اس کی بی بی کے اصرار سے دو ایک نوالے کھا کر خاموش ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

گرمی کا قیامت خیز موسم۔ آفتاب چودہ ساڑھے چودہ گھنٹے مسلم کے ماہ پاروں پر نگاہ جما کر متزلزل ہو گیا۔ اور ماہ ذی الحج کا قمر چہار دہم عقیل کے راج دلاروں کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ طوعہ اور اس کی بی بی دونوں نے کوٹھری کھولی۔ بچھونا کیا اور دونوں کو پیار کر کے لٹا دیا کہ آرام کرو۔ قفل لگا کر دونوں کی دونوں خاموش بیٹھ گئیں۔ شب ماہ کا ابتدائی حصہ طے ہو چکا تھا کہ گھر کا مالک حارث داخل ہوا۔ اور بیوی سے کہا۔ دیکھئے مسلم کے بچوں کا انعام کس کی تقدیر میں ہے۔ دن بھر مارا مارا پھرا ہوں۔ کوئی کونا کھدرا ایسا نہیں۔ جو نہ ڈھونڈ ڈالا ہو مگر ہماری تقدیر ایسی کہاں۔

بیوی۔ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ معمولی یتیم بچوں پر رحم کرنا خدا کی رضامندی ہے۔ نہ کہ اہل بیت کے چراغ۔ ابن زیاد ملعون اپنا گھر دوزخ میں بنا چکا۔ دنیا فانی ہے۔ بن باپ کے بچوں کے درپے نہ ہو۔ یہ دولت و

انعام ہمیشہ نہ رہے گا۔ صاحب اولاد ہو۔ سوچو اور سمجھو۔ ان کو مار کر دولت نہ لو۔ رحم کرو۔ اور جنت لو۔

حارث۔ کم بخت بے وقوف عورت ہے۔ کیا سمجھ سکتی ہے۔ ہٹ جا سامنے سے۔ دولت ہی نہیں عزت اور مرتبہ بھی تو ہے۔

ماں کے کلیجے سے چمٹ کر سونے والے بچے اس وقت اندھیرے گھُپ میں بے خبر پڑے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے سوتے ہیں۔ باپ شہید ہوا۔ ماں کا بچھوا چھوٹ گیا۔ کوٹھری کی دیواریں اور دروازے کے کواڑ باپ کی آغوش اور ماں کی ممتا تھے۔ چھوٹے نے باپ کی صورت خواب میں دیکھی۔ کئی روز سے چھوٹا ہوا تھا۔ آنکھیں اس صورت کو ترس گئی تھیں۔ بیتاب ہو کر چیخ اُٹھا۔ اور بلکتے دوڑا۔ بڑے نے تسکین دی سینے سے لگایا۔ اور خاموش کرنا چاہا۔ مگر معصوم جذبات قبضے میں نہ آسکے پھر رویا اور چلا کر کہا "یا ابّاہ"۔

ہوا نے یہ آواز حارث کے کان میں پہنچائی۔ متحیر ہو کر اُٹھا۔ کوٹھری کھولی۔ چراغ جلا کر دیکھا تو دو بچے دبکے سکڑے بیٹھے ہیں۔ پوچھا "تم کون ہو؟" معصوم اس گھر کو دارالاماں اور گھر والوں کو خیر خواہ سمجھے ہوئے تھے جلدی سے کہا۔ "مسلم مظلوم کے بچے"۔

حارث یہ سنکر آگ بگولا ہو گیا۔ بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لایا۔ تھپڑ مارے اور کہا "دن بھر حیران اور پریشان کیا۔ کھانا نصیب نہ ہوا۔ اور تم یہاں مزے سے سو رہے ہو۔" رسی سے مشکیں باندھ دیں۔

طوعہ حارث کے سامنے آئی اور کہا۔ "یہ معصوم بچے بے گناہ ہیں ان

کے پھول سے رخسار اور نازک بازو تیرے تھپڑوں اور مکّوں کے قابل نہیں ان پر یہ مصیبت میں لائی ہوں۔ میں نے ان کو دغا دی۔ دھوکے سے یہاں لائی۔ اور تیرے جنگل میں پھنسا دیا۔ یہ باپ اور ماں دونوں سے چھوٹ گئے۔ غریب الوطن اور قابل رحم ہیں۔ ان کی آنکھیں رو رہی ہیں۔ ان کے دل تڑپ رہے ہیں۔ یہ دوزخ و جنت کے مالک ہیں۔ ان پر رحم کر۔ یہ نازک وقت میں تیرے کام آئیں گے۔ اور جہاں کوئی کسی کے کام آنے والا نہ ہوگا۔ وہاں یہ تیرا بیڑا پار کر دیں گے۔"

حارث اس تقریر سے اور بھی برافروختہ ہوا اور برُا بھلا کہنا شروع کیا۔

طوعہ بچوں کے قدموں پر گری اور کہا۔ "آنکھ کے تارو۔ میری نیّت کا حال خدا جانتا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میری تقدیر کا لکھا آگے آیا۔ تمہارے طمانچوں کے نشاں میرے دل پہ ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں قیامت کے روز مجھ گنہگار کی لاج رکھ لینا۔

حارث کی شومی تقدیر پر صبح کھلکھلا کر ہنسی اور ظالم دونوں معصوموں کو دریا کے کنارے لے گیا۔ سنگ دل کی تیغ آب دار بچوں کے سر پر چمکی۔ بیوی اور طوعہ سامنے آئیں اور مسلم کے لال سینے سے چمٹا لیے۔ مگر سفاک نے ان دونوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اور بچوں سے کہا۔ "اب تم تیار ہو جاؤ کہ یہ تلوار تمہاری گردنیں جُدا کرتی ہے۔" محمد نے اس وقت منت سے کہا "صرف ہماری ایک التجا ہے اور اس کو قبول فرما کر ہماری مشکل آسان

کر دے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے میری گردن اُتار تاکہ میں اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم کی موت نہ دیکھوں۔ اس وقت اس کا باپ ماں یا چوچھ ہوں۔ وہ میں ہوں" ابھی یہ گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ چھوٹے نے بھی یہ التجا کی اور حارث کے ایک وار نے دونوں بھائیوں کی گردنیں تن سے جدا کر دیں۔

ان بچّوں کی شہادت تمہید تھی۔ اس دُعا کی جو کربلا میں پورا ہوا۔ جہاں بہتر تنوں نے ایک جمّ غفیر کے مقابلے میں صبر و استقامت کا ایسا نمونہ دکھایا کہ مسلمان اس پر ہمیشہ فخر کریں گے۔ وجہ نزاع جو بڑھتے بڑھتے باعث خونریزی ہوئی۔ صرف بیعت یزید تھی۔ اور یزید کا فسق و فجور مے نوشی و مدہوشی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس کی بیعت شان امامت سے بہت کچھ گری ہوئی تھی۔

اس موقعے پر امام عالی مقام نے صبر و شکر کی ایسی یادگار اور کلیجے کے ٹکڑوں۔ برابر کے بھائیوں۔ جان نثار رفیقوں کی قربانی کا ایسا نمونہ چھوڑا۔ جو آج تک عدیم النظیر ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ برخلاف اس کے اخذ بیعت کی آڑ میں یزید اور اس کے حواریوں نے شقاوت قلبی۔ سنگ دلی و بے رحمی اور ظلم و ستم کے وہ کارنمایاں انجام دئیے۔ جن پر لعنت برسی۔ اور برسے گی۔

محرم کی دسویں تاریخ کو ٹھیک دوپہر کے وقت جب تمام عزیز و رفیق ستم یزید کے شکار ہو چکے۔ پھول سے بچے جوان شیر۔ برابر کے بھائی۔ جام شہادت سے سیراب ہو گئے۔ اور کوئی نام کو باقی نہ رہا۔ تو امام نے دیکھا کہ ایک بیمار عابد اور مظلوم عورتوں کے سوا سب کا صفایا ہو گیا۔ اس وقت عابد بیمار کو گلے لگایا۔ اور کہا "آج سب سادات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر تم زندہ رہے تو میرا

یہ پیغام نانا جان کی اُمت تک پہنچا دینا"۔

"مسلمانو! جس طرح میں ایک ظالم و غاصب کے مقابلے میں محض خدا کی رضامندی پر ثابت قدم رہا۔ بھلے وہ اسے لال میری آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے اور سینے پر لوٹنے والے دیکھتے ہی دیکھتے سامنے سے اُٹھ گئے۔ اصغرؑ اور اکبرؑ جیسے چاند گھری گوروں میں جا سوئے۔ اور عباسؑ جیسا بھائی خون میں نہا گیا اسی طرح کشمکش حیات میں تم بھی استقلال و ہمت سے کام لینا۔ جب تم پر کوئی مصیبت آئے۔ اُس وقت میرا یہ واقعہ یاد کرنا اور دل کو تسکین دینا۔ جب جوان بچے موت کی بھینٹ چڑھیں۔ اور دل زندگی سے اُکتا جائے! اس وقت میرے علی اکبرؑ کی موت سے سبق لینا اور جب کوئی شیر خوار بچہ گود خالی اور گھر سونا کر جائے۔ تو میرے علی اصغر کی حالتِ زار پیش نظر رکھنا۔ دنیا بجائے خود ایک فانی مقام ہے۔ اس کا ہر جلوہ عارضی اور ہر حالت غیر مستقل۔ مسلمانوں کو میری شہادت پر صرف رونا ہی نہیں۔ بلکہ میرے صبر کی تقلید اور شکر کی پیروی کرنی ہے تاکہ معبود حقیقی کی سچی رضامندی حاصل کریں اور اس گھر میں خوش و خرم رہیں۔ جہاں ابدالآباد رہنا ہے"۔

امام مظلوم کی شہادت کے بعد عابد بیمار یعنی زین العابدین نے یہ پیام مسلمانوں تک پہنچا دیا۔ اور آج گو ایام محرم میں اس یاد کو تازہ کرنے کے واسطے سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ لیکن دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس پیام کی تعمیل کہاں تک ہو رہی ہے اور ہم کہاں تک مصائب و آلام میں خدا کی رضامندی پر ثابت قدم ہیں۔

منشی پریم چند

منشی پریم چند موجودہ دور میں اُردو ناول اور اُردو افسانہ لکھنے والوں میں ممتاز ہیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جن کے یہاں یہ دونوں اوصاف فنی حیثیت سے کسی حد تک مکمل نظر آتے ہیں ورنہ ان سے پہلے ہمارے ناول اور افسانے اس قابل نہیں تھے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کا مقابلہ کر سکیں۔ پریم چند کی تصانیف کا مرکز بالعموم ہندوستان کے دیہات کی سادہ زندگی اور اس میں پیش آنے والے روز مرہ کے معمولی واقعات ہیں۔ پریم چند کا کمال یہی ہو کہ انھوں نے ان واقعات کو ایسے زاویے سے دیکھا ہو کہ اس میں نئی جاذبیت اور دلکشی پیدا ہو گئی ہو۔ مظلوم کاشتکار، ظالم اور جابر زمیندار، بے ایمان پولیس، حکومت کے چھوٹے بڑے ذمہ دار عہدہ دار جو جونک کی طرح مسلسل دیہاتیوں کا خون چوستے رہتے ہیں ان کے افسانوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ تہذیب معاشرت کی اصلاح بھی ان ناولوں کا ایک مقصد ہے غرض ناول جس کی تعریف یہ ہو کہ وہ زندگی کی ایک ایسی تصویر ہو جو زیادہ سے زیادہ حقیقت سے قریب آجائے اور افسانہ جو زندگی کے کسی ایک پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ پریم چند کی بدولت فنی معراج کمال کو پہنچے۔

ان کی زبان سادہ، پیرایہ بیان فطری اور انداز دلچسپ ہے۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر قدرت ہونے کی وجہ سے اُن کے یہاں ایک ایسی زبان ملتی ہے جسے صحیح معنوں میں ہندوستانی کہہ سکتے ہیں۔

عیدگاہ

رمضان شریف کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچے کی طرح پر تبسم۔ درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے۔ گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارک باد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سیکڑوں رشتہ قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا، وہ بھی دوپہر تک، کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لئے ہوں گے بچوں کے لئے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آگئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سیوئیوں کے لئے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں ان کی انھیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابا جان کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قائم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔

بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور رکھ لیتے ہیں۔ انھیں دو چار پیسوں میں دنیا کی نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار پانچ سال کا غریب صورت بچہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔ کہتی کس سے کون سننے والا تھا، دل پر جو کچھ گزرتی تھی سہتی تھی اور جب نہ سہا گیا دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لئے حامد خوش ہے۔ اُمید تو بڑی چیز ہے پھر بچوں کی اُمید اُن کا تخیل تو رائی کے پربت بنا لیتا ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹا سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا محمود اور محسن، نورا اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لئے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے "تم ڈرنا نہیں اماں، میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔ لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ

میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان تین کوس چلے گا۔ پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوئیاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا کیا اس وقت سوئیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس دن فہیمن کے کپڑے سینے تھے آٹھ آنے پیسے ملے تھے اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی جاتی تھی اس عید کے لئے۔ لیکن کل گھر میں آٹا نہ تھا۔ اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے۔ حامد کے لئے دو پیسے کا روز دودھ تو لینا ہی پڑتا ہے۔ اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن، مہترانی اور نائن سب ہی تو آئیں گی سب کو سوئیاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے گی اور منہ کیوں چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے زندگی خیریت سے رہے اور ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو ساتھ والوں کا انتظار کرتے یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سودا شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ

پھرہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا اُلّو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے۔ یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے، اتنے بڑے مدرسے میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی، بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ابھی تک پڑھتے جاتے ہیں۔ آج چھٹی ہے۔ لیکن ایک بار جب یہاں آئے تھے تو بہت سے داڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کُند ذہن، غبی، کام سے جی چرانے والے یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سنا ہے مُردوں کی کھوپڑیاں اُڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتا ہے اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو اندر نہیں جانے دیتا اور یہاں لوگ شام کو کھیلتے ہیں۔ بڑے بڑے آدمی کھیلتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ۔ ہماری اماں کو وہ دے دیا جاتا ہو۔ بیٹ تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا "ہماری امی جان تو پکڑ ہی نہ سکیں ہاتھ کانپنے لگے اللہ قسم"!

حامد نے اس سے اختلاف کیا "چلو منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں کے تلے اندھیرا آجائے"۔

محسن۔ لیکن دوڑتی تو نہیں۔ اچھل کود نہیں سکتی۔

حامد۔ کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمہاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمہاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔

پھر آگے چلے حلوائیوں کی دوکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نہ ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی۔ سنا ہے رات کو ایک آدمی ہر ایک دوکان پر جاتا ہے اور جتنا مال ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپیے دیتا ہے بالکل ایسے ہی چاندی کے روپیے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ایسے روپیے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے؟

محسن۔ جنات کو روپیوں کی کیا کمی۔ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک روک نہیں سکتے۔ جناب آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیئے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔

حامد۔ جناب بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔

محسن۔ اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے

میں گھس جائے۔

سمیع۔ سنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں۔ کوئی چیز چوری چلی جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھوا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری صاحب کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آ کر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔

اب ہر ایک کی سمجھ میں آگیا کہ چودھری قائم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آ کر انھیں روپیہ دے جاتے ہیں۔ آگے چلئے یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ، لیپ، پھام پھو!

نوری نے تصحیح کی۔ کیا کہا۔ یہ پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تھیر، بہت خیر ہے اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں شہر کے جتنے ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلے میں تو چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو۔ اور دوسرے محلے میں پکارتے ہیں جاگتے رہو، جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ لیکن تھیلیاں بھر بھر کر گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم، تھیلیاں بھر بھر۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا ماموں اتنے روپے کہاں سے لاتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ

ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

چاند نے تعجب سے پوچھا۔ یہ لوگ چوری کرواتے ہیں تو انھیں کوئی پکڑتا نہیں۔

نوری ان کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ ارے احمق انھیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن نہ بچا کئی دن درخت کے نیچے سوئے۔ اللہ قسم! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس، اپنی خستہ حالی میں مگن، صابر و شاکر چلی جا رہی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے تکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عیدگاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہو گئی ہے۔ اوپر املی کے درختوں کا سایہ ہے۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے۔ جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے

جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ دہقانیوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں، ایک ساتھ دو زانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پر احترام رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کئے ہوئے ہے۔

(۲)

نماز ختم ہو گئی ہے۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانیوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دوکان پر یورش کی۔ بوڑھے ان دل چسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر کبھی آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے۔ لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ اُن کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا

ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکھ کھانے کے لئے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے۔ لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آگیا۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بھشتی اور سپاہی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بھشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ وہ کیسے خوبصورت بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے خاکی وردی اور لال پگڑی کندھے پر بندوق معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لئے چلا آرہا ہے۔ محسن کو بھشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک ہے۔ مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے دوسرے ہاتھ میں رسّی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ جبہ۔ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں کی سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کوئی کتاب لئے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔

اگر دو کا کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں کھلونا فضول ہے۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے میرا بھشتی روز پانی دے جائیگا۔ صبح و شام۔

محمود۔ اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فیر کر دے گا۔

نوری۔ اور میرا وکیل روز مقدمہ لڑے گا اور روز روپے لائے گا۔

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی کے تو ہیں۔ گریں تو چکنا چور ہو جائیں۔ لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لئے انھیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دوکان ہے۔ طرح طرح کی ضروری چیزیں ایک چادر پر چنی ہوئی ہیں۔ گیند اور سیٹیاں اور بگل اور بھونرے اور ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے۔ محمود گیند۔ نوری ربڑ کا بط جو چوں چوں کرتا ہے۔ اور سمیع ایک خنجری اسے بجا بجا کر وہ گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اُس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اُسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لئے لپکتا ہے، لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔

خاص کر جب ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بچارہ یوں مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں کسی نے گلاب جامن، کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔ حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبو دار ہیں۔

حامد سمجھ گیا۔ یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں حامد کی طرف بڑھائیں، حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں۔ محمود اور نوری اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانا ہو گیا۔

محسن نے کہا۔ اچھا اب کے ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ حامد۔ اللہ قسم۔

حامد نے کہا رکھے رکھئے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

سمیع۔ تین ہی پیسے تو ہیں کیا کیا لو گے؟

محمود۔ تم اس سے مت بولو حامد۔ میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو۔

حامد۔ مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔

حسن۔ لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے؟

محمود۔ میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا چڑھا کر کھائے گا۔

حلوائیوں کی دوکانوں کے آگے کچھ دوکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لئے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دوکان پر ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا۔ اماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے گا تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ۔ مفت کے پیسے خراب ہوتے ہیں۔ زیادہ دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انھیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ برابر ہو جائیں گے۔ یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکتے ہیں ضد کر کے لے لیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے! روٹیاں توے سے اتار لو۔ چولھے میں سینک لو۔ کوئی آگ مانگنے آئے چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت کہ بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ ان کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی

پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے
ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھو لاؤ۔
اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں
اب منہ سڑے گا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی چٹوری زبان ہو جائیگی
تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہو گی۔
اس نے پھر سوچا، اماں دستپناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے
لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی ماں کے لئے دستِ پناہ لایا ہے
ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسنوں کو دکھائیں گی۔ سارے
گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انہیں
دعائیں دے گا۔

بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً
قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں جب ہی تو
محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو یوں مزاج دکھاؤں گا۔
وہ کھلونے کھیلیں اور مٹھائیاں کھائیں۔ میں غریب سہی کسی سے
کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا جان کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی پھر ان
لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لو گے۔ ایک ایک کو ایک ایک
ٹوکری دوں، اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک
کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دونگا
اور کتابیں دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑی لیں اور چڑھا چڑھا کے

کھانے لگے۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب خوب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے دوکان دار سے ڈرتے ڈرتے پوچھا یہ دستِ پناہ بیچو گے؟

دوکان دار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا "وہ تمہارے کام کا نہیں ہے"۔

"بکاؤ ہے یا نہیں"؟

"بکاؤ ہے جی۔ اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں"۔

"تو بتلاتے کیوں نہیں، کے پیسے کا دوگے"؟

"چھ پیسے لگیں گے!"

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔ "تین پیسے لوگے؟ اور آگے بڑھا کہ دوکان دار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دوکان دار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لئے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اس کا کیا کرے گا؟ حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ "ذرا اپنا بھشتی زمین پر گرا دو ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچا کی"۔

محمود۔ تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟

حامد۔ کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا

ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا جما دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!

سمیع متاثر ہو کر بولا "میری خنجری سے بدلو گے؟ دو آنے کی ہے۔"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ "میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا۔"

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!

اب دو فریق ہو گئے۔ محمود اور محسن! اور نوری ایک طرف حامد یکہ و تنہا دوسری طرف۔ سمیع غیر جانب دار ہے جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف جا ملے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا ہے۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی، ربڑ، لکڑی کی چیزیں ہیں۔ دوسری جانب اکیلا لوہا جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے وہ روئیں تن ہے۔

صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آجائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائیگا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا۔ "اچھا تمہارا دست پناہ تو پانی نہیں بھر سکتا"؟

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا کہ یہ بہشتی کو ڈانٹ بتائے گا تو وہ دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازہ پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب بھر اس سے چاہے گھڑے مٹکے کونڈے بھر ڈالو۔

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ بچا گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے۔ بولئے جناب!

حامد کے پاس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادہ سے پوچھا اسے پکڑنے کون آئے گا۔ محمود نے کہا یہ سپاہی بندوق والا!

حامد نے منہ چڑھا کر کہا۔ یہ بیچارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے اچھا لاؤ۔ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچا کی نانی مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بیچارے۔

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا اور کہا۔ "تمہارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا۔" حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ "آگ میں بہادر کودتے ہیں۔ جناب تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بھشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا۔ "تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے کرسی لگا کر بیٹھے گا۔"

اس حملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ بڑے پتے کے معرکے کی بات کہی۔ دست پناہ تو باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔

حامد نے دھاندلی کی۔ میرا دست پناہ باورچی خانہ میں نہیں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون اُن کے پیٹ میں ڈال دے گا۔

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈال دینے والی بات چھا گئی۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند اور سیٹی اور بطریں زور میں تھے مگر ان مشین گنوں کے سامنے اُن پٹاخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستم ہند ہے اس میں کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے وہ حامد کو ملنے لگا۔ اوروں نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز

نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا "ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو" حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن، محمود، نوری اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا۔ اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے کتنے خوبصورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں مگر ان کھلونوں کے لئے انھیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرز عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب تو دست پناہ رستم ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لئے حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستم ہند کی برکت تھی۔

(۳)

گیارہ بجتے بجتے سارے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی۔ میلے والے آگئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بھشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی کے جو اچھلی تو میاں بھشتی نیچے آرہے اور عالم جاودانی کو

سدھارے اس پر بھائی بہن میں مارپیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں۔ دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کئے۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا تو لحاظ کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ اُن پر چیڑ کا ایک پرانا پٹرا رکھا گیا۔ پٹرے پر سُرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو بمنزلہ قالین تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دنیائے فانی میں آرہے اور ان کے جسد خاکی کے پرزے پرزے ہو گئے۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی تاکہ بے کار نہ جا کر زاغ و زغن کے کام آ جائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے چلنے کی ذلت اُسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے "سونے والے جاگتے رہو" پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لئے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب

ہو گئی مگر مضائقہ نہیں۔ محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیا اس کی شاگردی کر سکتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیئے۔ گولر کا دودھ آتا ہے۔ ٹانگ جوڑی جاتی ہے۔ لیکن سپاہی جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عمل جراحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو چل نہ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیئے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا؟"

"میں نے مول لیا ہے۔ تین پیسے میں۔"

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ "یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہو گئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ، سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز ہی نہ ملی؟"

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا "تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں؟"

امینہ کا غصہ فوراً شفقت سے تبدیل ہو گیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں جو مرُیاں ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے

یہ بے زبان شفقت کی درد اور التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف! کتنی نفس کشی ہے کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لئے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے، مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیوں کر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا۔ اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

مولوی عبدالحق

آپ ہاپڑ ضلع میرٹھ میں تقریباً سنہ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ اور غالباً سنہ ۱۸۹۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ کچھ عرصہ تک پنجاب میں رہے پھر حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر کام کرنے کے بعد عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں پرنسپل مقرر ہوئے یہیں آپ نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی اور آپ ہی اس کے سکریٹری ہوئے اور آج تک ہیں سنہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں شعبہ اُردو کے صدر مقرر ہوئے وہاں آپ نے اُردو زبان کی کافی خدمت کی اور اس کا مرتبہ بلند سے بلند تر کر دیا۔ اس انجمن کی طرف سے ایک رسالہ سائنس اور دوسرا "اُردو" نکلتا ہے جن میں سارے مضامین تحقیقی اور علمی ہوتے ہیں۔ یہ نہایت مستند اور بلند پایہ رسالے مانے گئے ہیں۔ مضمون نگاری کا شوق آپ کو طالب علمی ہی سے تھا۔ سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے لئے آپ نے اسی زمانے میں "اُردو زبان کا مستقبل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو بہت مقبول ہوا اس سے آپ کی زبان دوستی اور زبان نوازی کا پتہ چلتا تھا۔ وہی جذبہ آج تک آپ کے دل میں موجود ہے۔ آپ کی انجمن کی گراں قدر خدمات نے اُردو زبان کی ترقی و اشاعت اور اصلاح کے لئے جو کچھ ادب

جتنا کچھ بھی کیا اُس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو اُردو زبان سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے آپ کی اس درجہ ادب نوازی پر الہ آباد یونیورسٹی نے آپ کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عنایت کی ہے۔ آپ کی انجمن ترقی اُردو کی شاخیں قریب قریب تمام ہندوستان میں قائم ہیں۔

آپ ایک نہایت مشاق اور پختہ کار ادیب ہیں۔ آپ کی زبان نہایت مستند۔ طرز تحریر انتہائی سلیس۔ اور انداز بیان حد درجہ واضح شگفتہ اور پُر زور ہے۔ موجودہ دور کے اُردو نقادوں میں آپ کا درجہ سب سے بلند ہے۔ آپ کے تنقیدی مضامین میں ادب و شعر کے بنیادی مسائل کم اور بہت کم ہیں پھر بھی جو کچھ اور جتنا کچھ آپ نے لکھا ہے نہایت وضاحت کے ساتھ بے لاگ لکھا ہے۔ آپ نے اُردو میں جا بجا ہندی الفاظ بھی قصداً استعمال کئے۔ مگر سب بہت سلیقہ کے ساتھ۔ آپ کی تحریر میں بہت پختگی ہے۔ تحقیقی مسائل اور قدیم دکنی ادبیات آپ کے پسندیدہ موضوعات اور عنوانات ہیں اگرچہ آپ کی مستقل تصانیف کم ہیں لیکن پھر بھی آپ نے جو متفرق مضامین اور مختلف مقدمات لکھے ہیں وہ اس کمی کو پورا کرتے ہیں اور مواد کے لحاظ سے کسی مستقل تصنیف سے کم نہیں ہیں۔

ادبِ اُردو اور حکمت

ایک زمانہ تھا کہ ہماری شاعری لطفِ صحبت اور تفنن کا کام دیتی تھی۔ وہ بھی ایک وقت تھا، دولت تھی، ثروت تھی، حکومت تھی، فارغ البالی تھی، دوسرے دنیاوی کاروبار کے ساتھ سامانِ عیش بھی تھا اور یہی سامانِ عیش کا ایک جز شاعری بھی تھی۔ لیکن وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ زمانہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ہمارے شاعر زمانے کی اس نیرنگی کو معشوقوں کے تلوّن سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن بیچارے معشوق خود اس زمانے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ اب زمانہ کچھ اور ہو گیا ہے اب نئے دور نے جنم لیا ہے نئے حالات کے ساتھ نئے خیالات اُمڈے چلے آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ نئی نئی مصیبتیں اور آفتیں بھی ہمارے سر پر تلی کھڑی ہیں۔ ان مصیبتوں کے ٹالنے اور ان آفتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں طرح طرح کی قربانیاں اور طرح طرح کی جد و جہد کی ضرورت ہے کیا اس جد و جہد کے لیے نئے آلات اور نئی حکمتوں کی ضرورت ہے کیا اس جد و جہد میں شاعر کا کوئی حصہ نہیں؟ کیا شاعر ہماری سوسائٹی اور ہماری قوم کا جزو نہیں؟ کیا وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق ہے؟ کیا وہ ہمارے آرام و آسائش اور ہمارے دُکھ درد اور ہماری مسرتوں اور آلام

میں شریک نہیں؟ کیا اس کا کام صرف مسخرگی اور دل لگی ہے؟ کیا اس کا دل ایسا پتھر اور اس کی جلد ایسی موٹی ہے کہ اس پر کبھی چوٹ کا اثر نہیں ہوتا؟ اگر یہ ہے تو وہ شاعر نہیں مسخرہ ہے۔

فن شعر کے لحاظ سے شاعر کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک نجی حیثیت ہے یعنی یہ کہ وہ شعر کس طرح کہتا ہے۔ مثلاً چت لیٹ کے یا پٹ لیٹ کے کھڑے کھڑے، یا لیٹے لیٹے، ٹہل ٹہل کر یا باقاعدہ میز کرسی پر بیٹھ کر اس سے ہمیں کچھ بحث نہیں۔ دوسری حیثیت اس کی وہ تعلق ہے جو اسے جمہور سے ہے اور یہی اس کی شاعری کی کسوٹی ہے یہ تعلق کیا ہے؟ اسے میں ایک جملہ میں عرض کئے دیتا ہوں۔ شاعر خلق اللہ کے لئے وہ کچھ کر سکتا ہے جو وہ خود اپنے لئے نہیں کر سکتا۔ شاعری میں ایک عنصر ایسا بھی ہوتا ہے جو اسے ایک دوسرے عالم میں لے جاتا ہے اور اسے اصلی اور حقیقی دنیا سے کچھ واسطہ نہیں رہتا اور اس عالم خیال میں اسے خاص لطف اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ اکثر نقاد شاعری کا مقصد صرف یہی سمجھتے ہیں اگر شاعر اس عالم خیال میں پہنچ کر وہیں کا ہو جائے تو بہک جاتا ہے لیکن اصلی شاعر اس عالم میں پہنچکر اپنے اصلی اندیشوں، اصلی خواہشوں اور اصلی اُمیدوں اور دل کی تہ میں چھپے ہوئے رازوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ تڑپ اُٹھتا ہے اور یہ تڑپ اسے حقیقی اور زندہ دنیا کی طرف کھینچ لاتی ہے اور اسے اس بدلتی ہوئی دنیا کے مقابلے کے لئے زیادہ اہل بنا دیتی ہے۔ ہم ایک دوسرے معاملہ میں ضرور دلچسپی لیتے ہیں لیکن یہ

یہ دلچسپی ایک قسم کا تفنن ہوتا ہے۔ جیسے اخباروں میں کرکٹ اور فٹ بال کے میچوں کے ذکر یا آپس کے تنازع اور جھگڑے سے، یہ دلچسپیاں عارضی ہیں۔ ان سے ہمدردی نہیں ہوتی جب تک کوئی ایسی قوت نہ ہو جو لوگوں کو نا انصافی، رسم و رواج کے تشدد اور گمراہیوں کے خلاف آمادہ کرائے کبھی کوئی سچی ہمدردی اور حقیقی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ سیاسی لیڈر کبھی یہ بات پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ وہ لوگوں کے تخیل کو ابھار نہیں سکتے۔ یہ شاعر ہی ہے جو اُن کے تخیل کو گدگداتا اور دبی ہوئی آگ کو بھڑکاتا ہے اور انھیں ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے وہ اپنے زور بیان تشبیہوں اور استعاروں، مبالغے اور تخیل کے زور سے منتشر قوتوں کو ایک جا جمع کر دیتا ہے، افراد کو جماعت میں منتقل کر دیتا اور کثرت کو وحدت میں بدل دیتا ہے۔ ساری قوم ایک فرد واحد ہو جاتی ہے۔ اس وقت اُن میں جذبۂ عمل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ زندگی کے اس مقصد کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں جس کی رہنمائی ایک سچا شاعر ہی کر سکتا ہے۔

ملک میں افلاس ہے، جہالت ہے، غلاظت ہے، گمراہی ہے، اور نہ معلوم کیا کیا خرابیاں ہیں۔ کیا یہ اس لئے ہیں کہ لوگ جہالت افلاس کو اچھا سمجھتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان لعنتوں کو اچھا سمجھتا ہو جب سب بُرا سمجھتے ہیں تو پھر ان کا وجود کیوں ہے؟ یہ ہیں اور رہیں گی اس لئے کہ جو لوگ ان لعنتوں میں مبتلا نہیں وہ ان سے کامل ہمدردی نہیں رکھتے ان میں مبتلا ہیں کامل ہمدردی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ مصیبت زدہ

کے رنج و تکلیف کا حقیقی احساس ہو۔ یعنی وہ شخص اپنے اوپر وہی حالت طاری کرے جو مصیبت زدہ پر ہے اور یہ کیفیت صرف تخیل ہی کی قوت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے سیاسی لیڈر کامیاب نہیں ہوتا۔ اور سچا شاعر کامیاب ہو جاتا ہے۔ جس قدر جس کا تخیل قوی اور تیز ہوگا اُسی قدر وہ اپنے اوپر دوسروں کی حالت طاری کرے گا۔ اور اسی قدر اس کی ہمدردی زیادہ قومی اور کامل ہوگی۔ شاعر کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ تخیل کو گدگداتا اور ابھارتا ہے اور اس میں خیال، جذبہ، عمل سب کچھ آجاتا ہے۔

حضرات! یہ کام ہماری اُردو کے تین شاعروں نے انجام دیا حالیؔ چکبستؔ اور اقبالؔ، ان کے کلام میں خلوص، درد اور جوش پایا جاتا ہے۔ ان تینوں نے ملک اور قوم کی وہ ضروری اور اعلیٰ خدمت انجام دی ہے جو کسی دوسری طرح ممکن نہ تھی۔ یورپی نقاد کہتے ہیں کہ شاعری کا ماحصل لطف و حظ ہے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ انھیں فارغ البالی حاصل ہے، سامانِ عیش و آرام مہیا ہے، تمدن کی بہت سی اعلیٰ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ لیکن ہم یہ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں صرف لطف حاصل کرنا ہی مقصود نہیں بلکہ ہمیں سکون و جمود کو بھی توڑنا ہے غفلت و کاہلی کو ہٹانا ہے، دلوں میں احساس و حرکت پیدا کرنی ہے اور سچ پوچھیے تو مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ ہمیں ایسے ہی شاعروں کی ضرورت تھی جیسے حالیؔ چکبستؔ اور اقبالؔ ہیں اور ان کا بڑا احسان

ہے کہ انھوں نے اپنے نغموں اور نالوں سے قوم کو جگانے کا کام لیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم دل سے اُن کا احترام اور عزت کرتے ہیں۔

یوں تو میں نے چکبست کا کلام پڑھا تھا لیکن تین سال کا عرصہ ہوتا ہے میرے ایک طالب علم نے جس کا مضمون اُردو تھا اپنے مقالے (تھیسس) کے لئے چکبست کو انتخاب کیا۔ اُسے یہ کام میری نگرانی اور ہدایت میں کرنا تھا۔ طالب علم محنتی اور شوقین تھا۔ اور محنتی اور شوقین طالب علم اُستاد کے لئے وبال جان ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مجھے بھی چکبست کا کلام غور سے پڑھنا پڑا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیسا قادر الکلام شاعر ہے زور بیان اور فصاحت زبان کے ساتھ خلوص اور درد بھی ہے وہ ملک کی بے بسی اور خستہ حالی کو دیکھ کر بیچین ہو جاتا ہے اور حال میں جو کچھ کہتا ہے اس کا ہر کلمہ اثر سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ آزادی کا دلدادہ ہے مگر بے لگامی کا روادار نہیں۔ وہ سچا لبرل ہے اور اس رستے پر چلنے والا ہے جو بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہے جس کا دوسرا نام اعتدال ہے لوگ اعتدال پر ہنستے ہیں اس لئے کہ وہ اس پر چل نہیں سکتے۔ انگریزی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے۔ مگر یورپ کا اندھا مقلد نہیں۔ وہ اپنے ملک کی معاشرت اور رسم و رواج سے خوب واقف ہے اور اُن کے عیب چُن چُن کے دکھاتا ہے لیکن وہ یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ نئے خیالات کی رَو میں ہماری خوبیاں بھی بہہ جائیں وہ جذبات انسانی سے گہری واقفیت رکھتا تھا۔ اور بعض اوقات نازک جذبات

کو موقع پر بڑی خوبی اور حسن سے ادا کرجاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ بھی
معمولی نہیں وہ حقیقت اور واقعیت کو خوبصورت تشبیہوں اور
استعاروں میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ تصویر کھنچ جاتی ہے اور
یہ سب باتیں اس زبان میں فصاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے جو ہماری
اور یک جہتی کی سب سے بڑی اور قابل قدر یادگار ہے اور آیندہ
بھی آپس کے اتحاد میں کارگر ثابت ہوگی۔ اس نے اپنے کلام سے
اُردو زبان کا مرتبہ بڑھا دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُردو ادب میں
اپنی جگہ قائم کردی۔ بلاشبہ اس کا شمار ہمارے اساتذہ میں ہے۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نام ہے شاہ نظام الدین اولیا کے خاندان سے تعلق کی بنا پر اپنے نام کے آگے نظامی لکھتے ہیں۔ اسی درگاہ میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم مکمل کرکے انگریزی کی طرف توجہ کی۔ آپ ایک صوفی مشرب بزرگ ہیں۔ سماع (قوالی) کے زبردست حامی اور دلدادہ ہیں۔ عام لوگوں پر آپ کا اثر ہے مگر مسلمانوں کے اکثر حلقوں میں آپ کا بہت اثر ہے۔ آپ کو وائل عمری ہی سے مضمون نگاری کا بیحد شوق تھا اور وقتاً فوقتاً اخبارات اور رسالوں میں بھی مضامین بھیجتے رہے جو عام پبلک میں بہت مقبول ہوئے۔ مستقل طور پر آپ نے سنہ ۱۹۰۸ء سے تصنیف کا کام شروع کیا اور سنہ ۱۹۱۹ء تک تقریباً پچاس کتابیں لکھ ڈالیں اس کے علاوہ جو مضامین اخبارات و رسائل کے لئے لکھے ہیں وہ الگ۔ وہ انشا پردازی و تصنیف کے معاملے میں سب سے بڑھ کر مانے گئے ہیں اور جس موضوع پر بھی ہو چاہے وہ طبع زاد ہو کوئی فرمائشی یا فی البدیہہ بہت جلد شروع کرکے ختم بھی کر دیتے ہیں یہ اُن کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

خواجہ صاحب کی تحریر میں حد درجہ سادگی اور انتہائی سلاست ہوتی ہے۔ سادہ اور معمولی خیالات میں صرف اپنے طرز بیان سے رنگینی اور دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ ٹکسالی اردو لکھتے ہیں دہلی کی زبان اور محاورات

بڑے مزے سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان آزاد کی طرز تحریر سے متاثر نظر آتا ہے۔ مگر سلاست خیال آفرینی اور شگفتگی کے علاوہ خواجہ صاحب کے معجز نگار قلم اور لطیف مزاج کی وجہ سے وہ قطعی طور پر ایسے ایک انفرادی رنگ کے مالک ہیں۔ اور صاحب طرز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُردو زبان کے بہت بڑے محسن ہیں۔

خواجہ صاحب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اکثر نہایت پامال اور فرسودہ عنوان پر قلم اٹھاتے ہیں مگر اپنی امتیازی خصوصیت سے ان عنوانات میں گویا جان ڈال دیتے ہیں چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں اس میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں ان میں اگر ایک جگہ ادیبانہ آن سے عقلی نکات بیان کرتے ہیں تو کہیں صوفیانہ شان سے روحانی اسرار بھی پیدا کر کے اس میں تاثیر بھی پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہے اُن کا خاص طرز بیان اور انداز تحریر جس کے متعلق ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے ان کی تصنیف "بیوی کی تعلیم" دیکھ کر کہا کہ "میں شعر موزوں کرنا چھوڑ دیتا اگر خواجہ حسن نظامی کی سی نثر لکھنے پر مجھ کو قدرت حاصل ہوتی"۔ ان کا کلام شان و شوکت اور سوز و گداز سے یکسر خالی ہوتا ہے لیکن جہاں بالقصد انھوں نے المیہ داستان اور دردناک واقعات لکھے ہیں وہ بہت پُر اثر ہیں۔ دلی کے عبرتناک واقعات پر ان کی کئی کتابیں ہیں۔ بیگمات کے آنسو۔ بہادر شاہ کا مقدمہ۔ دہلی کا آخری سانس یہ کتابیں بہت مقبول ہیں۔

گلاب تمہارا کیکر ہمارا

ان سب شاعروں کو سامنے سے ہٹاؤ جو گلاب کے پھول پر مرتے ہیں سینکڑوں برس سے ایک ہی چہرے کے طلب گار ہیں۔ یہ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ مقلد ہیں۔ تحسنی شنائی تقلیدی باتوں پر جان دیتے ہیں۔

میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔ مجھ کو ایک اور آنکھ ملی ہے جو ان سب سے اونچی ہے۔ میرے دل کی ہم نشینی و ہمسری کے ان میں ایک بھی قابل نہیں ہے۔ میں ہوں۔ سب بندوں کی شکل ہوں۔ میں بشر ہوں۔ تمام نبی آدم کے برابر درجہ لے کر آیا ہوں۔ میں نبی نہیں ہوں۔ ولی نہیں ہوں۔ مہدی اور عیسٰی نہیں ہوں۔ دعوئی خودنمائی و خودستائی سے بھی انکار ہے۔ مگر میں عالم تعین و ہستی شمال کی ایک تصویر ہوں اور اسی لئے یہ تعلی اور خود رائی ہے تاکہ میں خود کو اپنی خودی دکھاؤں اور خطاب کروں کہ جتنے یہ تک جوڑنے والے شاعر ہیں، سب نے گلاب کے پھول کو تختہ مشق بنایا ہے۔ کوئی اس کی بھینی بھینی بو پر فدا ہے کوئی اس کی نازک پتیوں پر نثار ہے۔ کسی کو اس کے رنگ سے رخسار محبوب کی یاد پیدا ہوتی ہے۔ کسی کا دل اس کے کھلنے اور مرجھانے کے انقلاب میں اسیر ہے۔ بعض ہیں جو گلاب کے خار سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ خیر یہ جتنی باتیں ہیں ان میں تو شکایت کا کوئی موقع نہیں ہے،

کہنا یہ ہے کہ انھوں نے خدا کی بے شمار مخلوقات کی حق تلفی کی، ایک ہی دروازے پر ڈیرے ڈال دیئے۔ ایک ہی آئینہ کی دید میں مدہوش ہو کر رہ گئے اور ان بیشمار جلووں کو نہ دیکھا جو ان کے لئے صفحۂ ہستی پر نمودار کئے گئے تھے۔ یہ انھوں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اس میں ان سے ایسا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی سزا نہایت ہولناک ہونی چاہیئے۔ گلاب کی الفت میں باغ لگائے، چمن بنائے، مالی محافظ بٹھائے، پانی کھدوائے اور زمین کے تختوں کو سیراب کیا، پھولوں کی ٹہنیوں کے سامنے اپنے تخیل کے ذوق کو سجدے کرائے۔ مگر اپنے تصور کو اتنی آزادی نہ دی کہ وہ اس کائنات کے ہر پھول تک جاتا۔ ان لوگوں کو یہ نصیب نہ ہوا کہ جنگل میں نکل جاتے۔ خود رو پھولوں کو دیکھتے جن کا مالی خدا ہے جن کا چمن صحرا ہے جن کی سیرابی قدرتی سیرابی ہے۔ ان میں ایک کیکر تھا۔ کیا چپ چاپ تھا۔ کیا مضبوط و توانا تھا۔ اس کی شاخیں دیکھی ہوتیں۔ اس کی پتیوں پر غور کیا ہوتا۔ گلاب کی ٹہنی میں کیا رکھا ہے۔ ایک کمزور لچکنے اور ٹوٹ جانے والی شاخ ہے جس کو آجکل کے شہ زور زمانہ میں بقول ڈارون، رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ وقت ان کی زندگی کا ہے جو حوادث ایام کا مقابلہ کر سکتے ہیں، جن کے اعضاء دوسروں کے کام آتے ہیں۔ کیکر کی چھال مفید جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑیاں جلنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں اور آدمی کو دودھ دیتی ہیں۔ کیکر کی پھلیاں بھی

چارہ اور رنگ بنانے میں کام آتی ہیں۔

یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں۔ پیٹ میں درد ہو تو گلقند کھلاؤ۔ ہیضہ ہو تو گلاب پلاؤ۔ مر جاؤ تو قبر پر چڑھاؤ۔ اور بھی کوئی کام اس نگوڑے سے نکلتا ہے۔

گلاب کے کانٹوں کو دیکھو کیسے دھوکہ باز ہیں۔ دکھائی نہیں دیتے۔ ہاتھ لگاتے ہی چبھ جاتے ہیں۔ کیکر کے کانٹے دور سے نظر آتے ہیں۔ کیا مجال کہ بے خبری میں کسی کو ستائیں۔

گلاب کے کانٹے سوکھ جائیں تو پھینک دینے کے قابل۔ کیکر کے کانٹے سوکھ کر گھروں اور کھیتوں کی حفاظت کریں۔ اس پر طرّہ یہ کہ کیکر کا کانٹا کیسا سیدھا سادا اور نکیلا ہوتا ہے۔ رنگ دیکھو تو وہ بھی انوکھا نرالا۔ شاعروں کے گلاب کو یہ بات کہاں میسر؟

گلاب کے درخت میں پتے بالکل بدشکل اور بے کار۔ کیکر کی پتیوں کے کیا کہنے۔ کیسی چھوٹی چھوٹی اور ننھی ننھی پتیاں ہیں کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔

کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا ہے۔ گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ میں کملا اور مرجھا جاتا ہے اور کیکر کا پھول جھونوں [illegible] کا مقابلہ کرتا ہے اور آجکل تعریف اسی کی ہے جو دشمن کے مقابلے میں زندہ سلامت رہے۔

گلاب کا پھول سرخ یا سرخی مائل اور ایسا کچا کہ مالیوں کی استادی

سے رنگ بدل دیتا ہے مالی جس کو چاہیں سُرخ رکھیں جس کو چاہیں سفید بنا دیں۔

کیکر کا پھول اپنے رنگ میں پختہ۔ سارے جہان میں ایک ہی زرد رنگ۔ کیا مجال جو کوئی شخص اس کے رنگ کو بگاڑ سکے۔

شاعر کہتے ہیں گلاب کے پھول سے معشوق یاد آتا ہے۔ میں کہتا ہوں کیکر کے پھول سے عشق یاد آتا ہے جس سے انسان کی رنگت زرد ہو جاتی ہے۔

اب بتاؤ عشق اچھا یا معشوق۔ عشق نہ ہوتا تو نہ عاشق کو کوئی پوچھتا نہ معشوق کی کچھ وقعت ہوتی۔ یہ عشق ہی کی بدولت سب بستیاں آباد ہیں۔

ارے نادان تجھے شاعروں سے کیا کام۔ پہلے اپنے وجود کے تخیلات کو درست کر۔ ان میں فطرت شناسی کا ملکہ خود اپیدا ہوتے دے۔ آج گلاب کو چھوڑ کر کیکر کے آگے جھومتا ہے۔ کل اس کو بھی چھوڑ دیو۔ کسی اور پیکر کے جلوہ میں دھیان جمائیو۔ ساری دنیا میں کانٹے پھیلے ہوئے ہیں، کس کس جگہ جھاڑو دے گا۔ خود جوتی پہن لے اور راستہ چلنے لگ۔

ہاں تو حق پر ہے۔ ہاں یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی وہ راہ ہے جو منزل جاناں تک جاتی ہے۔ من و تو کا حجاب اٹھا۔ اس کے بعد خود اپنی خودی کا پردہ کھول کر اندر گھس جا۔ پھر یہ آواز نہ آسکے گی کہ:۔

گلاب تمہارا اور کیکر ہمارا

شہزادے کا بازار میں گھسنا

یہ دلی جس کو ہندوستان کا دل اور حکومت کا تخت گاہ کہتے ہیں جب آباد تھی اور لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع ٹمٹما رہی تھی آفت اور بلا میں مبتلا ہونے کو ہوئی تو پہلے اس کے باشندوں کے عمل میں فرق آیا۔ الناس علی دین ملوکھم پہلے حاکموں کے اعمال خراب ہوئے اس کی رعیت بھی بداعمالیوں میں پڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجا پرجا دونوں برباد ہو گئے۔ مثالیں ہزاروں ہیں مگر ذیل میں ایک نہایت عبرتناک کہانی سناکر میں باشندگان ہند کو عموماً اور مسلمانوں اور صوفیوں کو خصوصاً خدا کے خوف سے ڈراتا ہوں۔

(۱)

غدر سے ایک برس پہلے دلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھرتے تھے اور بے پروائی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں فاختاؤں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لئے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر خدا کی یاد کی تسبیح پڑھ رہی تھیں غلے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آنکلا اور اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام کر کے عرض کیا کہ میاں صاحبزادو! ان بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے

ہو۔ انھوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ ان کے بھی جان ہے یہ بھی تمھاری طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم بادشاہ کی اولاد ہو۔ بادشاہوں کو اپنے ملک کے رہنے والوں پر محبت اور مہربانی کرنی چاہیے یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں ان کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے تو شان بادشاہی سے دور نہیں۔"

بڑے شہزادے نے جس کی عمر ۹ برس کی تھی شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھ دی مگر چھوٹے مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے "جا رے جا۔ دو ٹکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے۔ تو کون ہوتا ہے ہم کو سمجھانے والا۔ سیر و شکار سب کرتے ہیں ہم نے کیا تو کون سا گناہ ہو گیا"۔ فقیر بولا "صاحب عالم ناراض نہ ہوں۔ شکار ایسے جانوروں کا کرنا چاہیے۔ ایک جان جائے تو دس پانچ جانوروں کا پیٹ تو بھرے۔ ان ننھی ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ۔ بیس مارو گے تب بھی ایک آدمی کا شکم سیر نہ ہو گا"۔ نصیر مرزا فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک غلہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بیچارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "ہائے ٹانگ توڑ ڈالی"۔ فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے کے قبرستان کی طرف چلنے لگا۔ گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "وہ تخت کیونکر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑ دی خدا تیری بھی ٹانگیں توڑے

اور تجھ کو بھی اسی طرح گھسٹنا نصیب ہو۔

(۲)

توپیں گرج رہی تھیں گولے برس رہے تھے۔ زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ شہر دہلی ویران اور سنسان ہوتا جاتا تھا کہ لال قلعہ سے پھر وہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف بیس پچیس گورے سپاہی دھاوا کرتے چلے آتے تھے انھوں نے ان نو عمر سواروں پر یک لخت بندوقوں کی باڑ ماری گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور یہ سب شہزادے فرش خاک پر گر کر خون میں تڑپنے لگے۔ گورے جب قریب آئے تو دیکھا دو شہزادے جان بحق ہو چکے ہیں۔ مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اس کے کہیں زخم نہیں آیا۔ گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھرچیں آگئی ہیں اور دہشت کے مارے غشی طاری ہو گئی ہے۔ صحیح سالم دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دئے گئے۔ اور حراست میں کر کے دو سپاہیوں کے ہاتھ کیمپ میں بھجوا دیا گیا۔ کیمپ پہاڑی پر تھا جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی۔ جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم ہوا کہ اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

(۳)

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگ گئیں اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھس گیا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو گئے تیموری بزم کا چراغ جھلملا کر گل ہو گیا۔ اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے آباد ہونے لگا۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے۔ اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔

اسی دار و گیر میں پہاڑی کمپ پر مرزا نصیر الملک رسّی سے بندھے بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہا جائیے میں نے آپ کی رہائی کے لئے صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہے جلدی بھاگ جاؤ ایسا نہ ہو کہ کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔

مرزا بیچارے پیدل چلنا کیا جانیں حیران تھے کہ کیا کریں۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا پٹھان کا شکریہ ادا کر کے اٹھے اور جنگل کی طرف ہو لئے چل رہے تھے مگر یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہونگے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے زبان خشک ہو گئی، حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ تھک کر ایک درخت کے سایہ میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا ہم کہاں جائیں کدھر ہمارا ٹھکانا ہے اوپر نگاہ اٹھائی تو درخت پر نظر گئی دیکھا کہ فاختہ کا ایک گھونسلہ بنا ہوا ہے اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی

ہے۔ اس کی آزادی اور آسائش پر شہزادہ کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے کہ فاختہ! مجھ سے تو تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے۔ میرے لئے تو آج زمین آسمان میں کہیں جگہ نہیں ہے۔

تھوڑی دور ایک بستی نظر آتی تھی ہمت کرکے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے گر اُفتم پُشتم گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو عجیب سماں نظر آیا۔

ایک درخت کے نیچے سینکڑوں گنوار جمع تھے اور چبوترہ پر ایک تیرہ سالہ کی معصوم لڑکی بیٹھی تھی جس کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کان لہو لہان ہو رہے تھے اور دہقانی اس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ جونہی مرزا کی نگاہ اس بچی پر پڑی اور اس بیچاری نے مرزا کو دیکھا دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔

بھائی بہن کو اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ مرزا نصیر الملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر قلعہ سے قطب صاحب کو چلی گئی تھی۔ مرزا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس آفت میں مبتلا ہوگی۔ پوچھا تکہ تم یہاں کہاں؟

رو کر بولی!

اکا جی گوجروں نے ہم کو لوٹ لیا، نوکروں کو مار ڈالا اماں جان کو دوسرے گاؤں والے لے گئے اور مجھ کو یہاں لے آئے میری

بالیاں انھوں نے نوچ لیں۔ میرے طمانچے ہی طمانچے مارے ہیں۔

اتنا کہہ کر لڑکی کی ہچکی بندھ گئی اور پھر کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا۔

بیکس شہزادے نے اپنی غریب بہن کو دلاسا دیا اور ان گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اس کو چھوڑ دو۔ گوجر بگڑ کر بولے۔ ارے جا آیا بڑا بیچارا۔ ایک گنڈا سا ایسا ماریں گے کہ گردن کٹ جائے گی۔ اس کو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں۔ لا دام دے جا' اور لے جا۔

مرزا نے کہا۔ چودھریو! دام کہاں سے دوں۔ میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے قابل ہوں' دیکھو ذرا تم رحم کرو کل تم ہماری رعیت تھے اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے۔ آج آنکھیں نہ پھیرو' خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے۔ اگر ہمارے دن پھر گئے تو مالا مال کر دیں گے۔

یہ سن کر گنوار بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ او ہو! آپ بادشاہ سلامت ہیں تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھ بیچیں گے اور یہ چھوکری تو اب ہمارے گاؤں کی ٹہل کرے گی۔ جھاڑو دے گی۔ ڈھوروں کے آگے چارہ ڈالے گی۔ گوبر اٹھائے گی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے انگریزی فوج آ گئی اور گاؤں والوں کو گھیر لیا۔ اور چار چودھریوں کو اور ان دونوں شہزادے شہزادی کو پکڑ کر لے گئے۔

(۴۴)

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں اور جس کو انگریزی افسر کہہ دیتے کہ قابل دار ہے اسی کو پھانسی دی جاتی تھی۔ ہر روز سینکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جاتے گولیوں سے اڑائے جاتے اور تلوار سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اسی خونریزی سے تہلکہ تھا۔ مرزا نصیر الملک اور ان کی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ اور صاحب نے ان دونوں کو خوردسال سمجھکر بیقصور سمجھا اور چھوڑ دیا۔ دونوں نجات پاکر ایک سوداگر کے ہاں نوکر ہو گئے۔ لڑکی سوداگر کے بچے کو کھلاتی تھی اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف لایا کرتے تھے۔ چند روز کے بعد لڑکی تو ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئی اور مرزا کچھ دن ادھر اُدھر نوکریاں چاکریاں کرتے رہے آخر کار سرکار نے اُن کی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

ایک برس کا ذکر ہے دہلی کے بازار چتلی قبر، کمرہ بنگش وغیرہ میں ایک پیر مرد جن کا چہرہ چنگیزی نسل کا پتہ دیتا تھا۔ کولھوں کے بل گھسٹے پھرا کرتے تھے۔ ان کے پاؤں شاید فالج سے بیکار ہو گئے تھے اس لئے ہاتھوں کو ٹیک کر کولھوں کو گھسٹتے ہوئے راستہ چلتے تھے۔ ان کے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حسرت سے دیکھتے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے جن لوگوں کو ان کا حال معلوم تھا

ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈال دیتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ
ان کا نام مرزا نصیر الملک اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری
پنشن قرضہ میں برباد کر دی اور اب خاموش گداگری پر گذارہ ہے
مجھ کو ان کے حال سے عبرت ہوتی تھی۔ اور جب ان کا ابتدائی
قصہ جو کچھ خود ان کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سنا
تھا یاد آتا تو دل ہل جاتا تھا کہ اس فقیر کا کہنا پورا ہوا جس کی ٹانگ
میں انھوں نے غلہ مارا تھا۔ شہزادہ صاحب کا بازار میں گھسٹتا پھرنا
سخت سے سخت دل کو موم کر دیتا تھا اور خدا کے خوف سے دل
کانپ جاتا تھا۔ اب ان شہزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

نیاز فتحپوری

نیاز محمد خاں نام ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا وطن فتحپور ہے۔ فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ پھر ندوۃ العلما لکھنؤ اور مدرستہ العالیہ رامپور سے عربی فارسی کی درسیات ختم کر کے انگریزی اور ترکی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف رہے اور تھوڑے عرصہ میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔ اس کے بعد مختلف روزانہ اخبارات میں کام کرتے رہے۔ اب قریب قریب بیس سال سے ایک نہایت بلند پایہ ادبی اور علمی رسالہ "نگار" نکال رہے ہیں خود ہی اس کے اڈیٹر ہیں اُن کا یہ رسالہ اُردو زبان کے تمام رسالوں میں امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس سے ان کی وسیع النظری اور تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔

نیاز ایک بلند پایہ ادیب۔ انشا پرداز اور نقاد ہیں۔ اور اُردو ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ان کا انداز بیان انگریزی طرز انشا سے بہت متاثر ہے اور طرز تحریر میں ایک گونہ انفرادیت پائی جاتی ہے پہلے زبان میں فارسیت اور عربیت

بہت غالب تھی الفاظ اگرچہ مترنم ہوتے تھے لیکن عبارتوں
میں نادر ترکیبوں اور تشبیہوں اور استعارات کی بہت بھرمار
رہا کرتی تھی۔ آپ کا رجحان مضمون نگاری کی طرف تھا۔ لطیفہ
نگاری جو لکھنؤ کا اثر تھا اس کی طرف خاص توجہ تھی اس لئے
آپ کے یہاں رنگینی تصنع کی حد تک تھی۔ مگر اب متواتر مشق
نے ان کو کامل اور پختہ بنا دیا اور اب اُن کی تحریروں میں بہت
کافی اعتدال پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے ان کا رنگ اور چمکا دیا
ہے۔ ان کے یہاں ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ شعریت ترنم
اور زور پایا جاتا ہے جس نے اُردو کے اسالیب بیان میں
ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ہر موضوع پر نہایت
بے باکی سے قلم اٹھاتے ہیں اور لکھتے ہیں بے انتہا جرأت سے
کام لیتے ہیں۔ عام تحریروں کے علاوہ ان کے رسالہ نگار کے
باب استفسارات میں اُن کی اس خصوصیت کا پتہ چلتا ہے
یہ خوبی اُردو کے انشا پردازوں اور ادیبوں میں کم پائی جاتی
ہے۔ آپ نے اقتصادی سیاسی ادبی اور مذہبی غرض یہ کہ تمام
موضوعات پر اپنے قلم پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہوئے قلم اٹھایا
ہے۔ اور اس میں بہت بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں لیکن
رومانی افسانوں نے آپ کی شہرت میں چار چاند لگا کر اس سے

کہیں زیادہ چمکا دیا ہے۔ یہ تمام افسانے تمام تر شعر و شراب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور رنگین انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں سے اکثر افسانے طبع زاد ہیں اور بقیہ دیگر زبانوں سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔

آپ کی تصانیف جن میں سے نگارستان، جمالستان، شہاب کی سرگزشت، گہوارۂ تمدن، جذبات بھاشا اور شاعر کا انجام قابل دید ہیں۔

چاند کا سفر

جیسے کسی نے یہ کہہ کر جگا دیا کہ ہوائی جہاز تیار ہے۔ ہاں یاد آیا مجھے بھی تو سفر کرنا تھا، اٹھا، ڈاڑھی مونڈی، کنگھا کیا، کپڑے بدلے، گرم کپڑوں کا صندوق۔ موٹے موٹے کمبلوں کا بستر اور ایک بکس مختلف ضروری چیزوں کا خادم کے ذریعہ سے موٹر پر پہنچایا اور چل دیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خیال آیا کہ ٹکٹ تو نہیں بھول آیا جیب میں ہاتھ ڈالا تو موجود تھا۔ یہ ٹکٹ ایک سال کا موسمی ٹکٹ تھا اور عمومی تھا۔ عمومی سے مراد یہ ہے کہ میں کرۂ ارض کے ہر مقام سے سفر کر سکتا تھا اور کرۂ قمر کے ہر مقام تک جا سکتا تھا۔ کاسموپولیٹن کمپنی چونکہ سب سے زیادہ معتمد علیہ کمپنی تھی اور اس کے جہاز بھی نہایت تیز رو اور آرام دہ ہیں۔ اس لئے کرایہ تو ضرور زیادہ ادا کرنا پڑا۔ لیکن میں نے اس کو ترجیح دی اور آخر کار سب کو خیرباد کہہ کر اس کرہ کی سیاحت کے لئے چل دیا جس کے تابناک وجود کی ہمارے کرۂ ارض کی بہت سی عشق خیز راتیں گردیدۂ احسان ہیں۔

دس منٹ میں پولو گراونڈ کے میدان میں پہنچ گیا اور کپتان کو ٹکٹ دکھا کر غیر ضروری سامان، چھت کے ایک کمرہ پر رکھوا کر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ بادلوں نے

ٹکڑے کہیں کہیں نظر آتے تھے لیکن بالکل دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہلکے اور شفاف۔ اتنے میں ایک شخص نے نیچے سے اشارہ کیا اور پائلٹ نے انجن سٹارٹ کر دیا۔ انجن کی کرخت آواز بلند ہوئی، جھنڈا کھول دیا گیا اور سامنے کا پہیہ گردش کرنے لگا۔ ہلکی سی جنبش ہوئی اور تین پہیوں کے اوپر جہاز تھوڑی دور چل کر فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا۔

میرے علاوہ نو آدمی اور بھی تھے جن میں سے تین عورتیں، دو نوجوان لڑکیاں اور چار مرد تھے۔ یہ سب امریکہ کے باشندے تھے اور براہ راست وہیں سے سوار ہوئے تھے۔ یہ جہاز دو درجوں میں منقسم تھا۔ اوپر کا درجہ اسباب کے لئے تھا اور دوسرا بیٹھنے سونے اور کھانے کے لئے۔ لیکن ہر کام کے لئے مختلف حصے تھے۔ کپتان کے کمرہ میں ایک طرف لاسلکی ٹیلیفون اور ریڈیو لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف ایک بڑی گھڑی نہایت ہی پیچیدہ مشینری کی نصب تھی جس کے ذریعہ سے درجۂ حرارت موسمی کیفیت طول البلد، عرض البلد، درجات فلکی اور خدا جانے کیا کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

میری جگہ بالکل دریچہ کے پاس تھی، اس لئے بلند ہوتے وقت نہایت اچھی طرح محسوس کرتا جاتا تھا کہ تمام مکانات اور درخت وغیرہ کس طرح چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد شہر کا بلند مینار صرف ایک چھوٹا سا دھبہ نظر آنے لگا۔ سردی بھی بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی بادل کے ٹکڑوں کے اندر سے ہم کو گذرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ بادل بالکل خشک تھے، اور دریچوں کے شیشوں پر ایک

ہلکے ترنم کے علاوہ اور کوئی اثر نہ پیدا کرتے تھے۔

جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس جہاز کے تمام مسافر پورے ہو گئے ہیں اور اب براہ راست بغیر راہ میں کہیں قیام کئے ہوئے سیدھے کرۂ قمر تک کا سفر کرنا ہے تو میرے اعصاب میں ایک خاص قسم کی بے چینی محسوس ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ دیکھئے وہاں کیونکر گذرتی ہے اور کس طرح واپسی ہوتی ہے۔

جہاز کی رفتار نہایت تیز ہوتی جاتی تھی اور سامنے جو رفتار پیمانہ لگا ہوا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اب ہم ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے تھے لیکن معلوم ہوا کہ ابھی اس کی دو چند رفتار اور بڑھے گی۔ میں بیٹھا ہوا اپنی اس نئی سیاحت کے متعلق غور کر رہا تھا کہ خادم آیا اور میرے سامنے کے مسافر کے پاس ایک تار لایا جو اسی وقت لاسلکی کے ذریعہ موصول ہوا تھا۔ یہ اُسے دیکھ کر فوراً اُٹھا اور ٹیلیفون کو امریکہ کے کسی کارخانے سے ملا کر کاروبار تجارت کے متعلق کچھ ہدایت دینے لگا۔

میں سخت حیران تھا کہ اس وقت جب کہ جہاز کم از کم ۲۰۰ میل کی بلندی پر فضا میں اُڑ رہا ہے کیوں کر امریکہ کے کسی آدمی سے براہ راست گفتگو کرنا ممکن ہے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے جو میرے سامنے ہو رہا تھا اور کوئی وجہ اس سے انکار کی نہ تھی۔

دن بھر کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی کیوں کہ اب کرۂ ارض کا کوئی حصہ ہم کو نظر نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا جہاز صرف

آسمان کے نیل میں تیرتا ہوا جا رہا ہے۔ ہوا چوں کہ ۰۰ا میل کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی اس لئے ہر شخص کے منہ سے آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور نبض کی رفتار ۱۵۰ فی منٹ تک پہنچ گئی تھی۔

شام کو چاند کے طلوع کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور وہ آج ہم سے زیادہ قریب نظر آتا تھا۔ ٹھیک اس وقت جب کہ ہم لوگ کھانا کھا کر سینما دیکھ رہے تھے کرۂ قمر سے ایک لاسلکی پیغام کپتان کو موصول ہوا۔ کپتان ہم لوگوں کے کمرہ میں آیا اور کہنے لگا کہ چاند کے بڑے سمندر میں شاید سیلاب ہونے کی وجہ سے جلد وہاں پہنچنا خطرہ سے خالی نہیں ہے، اس لئے یہ سفر کم از کم دس دن اور بڑھ جائے گا، کیونکہ جہاز کی رفتار کم کرنا ہوگی۔ بعض کو اس خبر سے خوشی ہوئی بعض کو رنج لیکن میں نے اس کو مذاق سمجھ کر کوئی اثر نہیں لیا اور سامنے پردہ پر نہایت لطف کے ساتھ میری پکفورڈ کی ایکٹنگ کو دیکھتا رہا۔ میں زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کرونگا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیوں کہ حقیقتاً اب جہاز میں کوئی نیا تجربہ نہ ہوتا تھا۔ وہی کھانا، پینا، سینما دیکھنا، اور سوجانا روز کا مشغلہ تھا۔ اب میرے مراسم لوگوں سے کافی طور پر بڑھ گئے تھے اور اس لئے کبھی کبھی برج کھیلنے میں بھی مشغول ہو جاتا تھا۔ ایک دن البتہ جہاز کا انجن کچھ برہم سا ہو گیا تھا۔ اور جہاز نیچے کی طرف مائل ہونے لگا تھا۔ لیکن کپتان نے فوراً دوسرا انجن کھول دیا اور پانچ میل سے زیادہ نہ اُترے تھے کہ جہاز پھر تازہ قوت

کے ساتھ صعود کرنے لگا۔ بیس دن کے بعد ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار بہت بڑھ گئی لیکن رفتار پیما صفر پر ہے۔ تھوڑی دیر میں کپتان مسکراتا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا سفر تو حقیقتاً آج ختم ہو گیا، اور اب ہمارا کوئی کام باقی نہ رہا۔ میں حیران تھا یہ کیا کہہ رہا ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ ہم کشش زمین کی حدود سے نکل کر کشش قمر کی حدود میں آ گئے ہیں تو میں اس کا مدعا سمجھا۔ الغرض ہم چاند کی طرف خود اپنی قوت سے نہیں جا رہے تھے بلکہ چاند خود ہمیں اس طرح کھینچ رہا تھا، جس طرح زمین پر کوئی ڈھیلا اوپر کی طرف پھینکے اور وہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف مائل ہو۔ جہاز اس وقت زمین کی طرف اترنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ چاند کی کشش دفعتاً اسے نہ کھینچ لے اور اس طرح یہ خطرہ باقی نہ رہا تھا کہ ہم چاند میں پہنچ کر دفعتاً کسی چیز سے ٹکرا جائیں گے۔ اس وقت سب سے زیادہ حیرت انگیز تجربہ میرے لئے یہ تھا کہ میرا بدن بالکل ہلکا ہو کر پھول سا ہو گیا تھا، اور جس وقت میں قدم اٹھاتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اڑ رہا ہوں۔

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب ہم حدود زمین سے دور ہو چکے تھے اور ہمارا سفر چاند کی فضا میں ہو رہا تھا۔ چاند کی فضا میں سفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ چاند کرۂ زمین کے گرد چکر لگا رہا تھا اور ہم بھی اس کے ساتھ تھے، یعنی اس طرح ہم اول اول اپنے کرۂ وطن کا طواف کر رہے تھے جو حب وطن رکھنے والوں کے لئے یقیناً حج اکبر سے کم نہیں ہو سکتا۔

جس طرح ہم زمین سے دوسرے ستاروں کو چمکتا ہوا دیکھا کرتے تھے، آج ہم اپنی زمین کو بھی اسی طرح چمکتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دوری کی وجہ سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوہی کا پھول۔

جس وقت کپتان نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو کرۂ زمین کی زیارت کرائی تو سب کو سخت حیرت ہوئی، کیوں کہ جس طرح ہم وہاں سے ہر ستارے کو اپنے سے بلند دیکھا کرتے تھے اس وقت زمین بھی ہم کو اتنی ہی بلند نظر آرہی تھی اور باوجود اس کے کہ کپتان نے نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ فضا میں بلندی و پستی کا کوئی مفہوم نہیں ہے لیکن بھلا کیا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بھلا ایسا کیونکر ممکن ہے اور فوراً مجھے ایک دوست کا خیال آگیا جو کہا کرتے تھے کہ اگر زمین گردش کرتی ہے تو اس کے سمندروں کا پانی کیوں نہیں بہہ جاتا۔ واقعی حیرت کی بات تھی کہ زمین جس کو ہم نیچے چھوڑ آئے تھے اس وقت ہم کو اوپر نظر آرہی تھی اور اس کے سمندروں کا ایک قطرہ بھی ہم تک نہ پہنچتا تھا عقل قبول نہیں کرتی کہ محض زمین کی گردش اور اس کی کشش اس قدر زبردست ہو کہ پانی ایسی سیال چیز کو روک لے اور بہنے سے باز رکھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ مذاق تھا یا سنجیدگی لیکن آخرکار ایک خاتون چلا ہی گئیں کہ مجھے تو تم جلدی سے چاند میں پہنچا دو یا زمین کی طرف واپس کر دو کیوں کہ واقعی اگر ہم اس محاذ میں ہیں جہاں .... زمین کے سمندر یا ہم بہہ کر نیچے کی طرف آسکتے ہیں .... تو اس سیلاب سے بچنا محال ہے۔"

سب لوگ ہنسے لیکن اس کی تشویش کم نہ ہوئی اور جب اس نے کپتان سے کہا کہ جلد سے جلد پہنچنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے تو اس نے جواب دیا کہ "آپ جہاز کی کھڑکی سے کود جانے کی ہمت کریں تو بہت جلد پہنچ سکتی ہیں لیکن اس عالم میں اس کا حال صرف اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا تجربہ کرے"۔ خاتون "یہ کیوں کر"۔

کپتان۔ "وہ اس طرح کہ چاند کی کشش آپ کو بالکل اسی طرح کھینچ لے گی جس طرح آپ ایفل ٹاور سے کوئی ڈھیلا نیچے کی طرف پھینکیں اور وہ چشم زدن میں زمین تک پہنچ جائے۔ اس وقت ہمارا جہاز بھی بالکل ایک ڈھیلہ ہی کی طرح چاند کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ لیکن اس کشش کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے سفر کا رخ پھر زمین کی طرف کر دیا ہے اور کشش قمر کے بالکل خلاف انجن کی قوت صرف کر رہے ہیں اس لئے وہ جا تو رہا ہے چاند ہی کی طرف لیکن ایک ڈھیلہ کی طرح نہیں بلکہ ایک طائر کے مانند۔ اگر آپ جہاز سے باہر ہو جائیں گی تو یقیناً ہم سے بہت پہلے پہنچ جائیں گی، لیکن بالکل اسی طرح جیسے چینی کے گل دان کو فرش پر پوری قوت کے ساتھ ٹپک دیا جائے۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ دفعتہً جہاز کی رفتار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور وہ ایک جگہ معلق رہ کر قائم ہو گیا۔ اس جھٹکے کو سب نے محسوس کیا اور ہر شخص اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میں سمجھا کہ شاید چاند کے کسی پہاڑ سے ہمارا جہاز ٹکرا گیا ہے لیکن بعد کو کپتان نے آکر اصل وجہ یہ بیان کی

کہ "چوں کہ جہاز کا انجن کششِ قمری کے بالکل خلاف اپنی قوت صرف کر رہا تھا اور میں نے اندازہ اسی کشش پیما سے کیا تھا جو زمین کے لئے مستعمل ہے اس لئے انجن کی مخالف قوت اور چاند کی کشش دونوں برابر ہو گئیں۔ اور جہاز رک کر رہ گیا۔ چوں کہ چاند زمین سے بہت چھوٹا کرہ ہے اسی لئے اس کی کشش بھی اسی نسبت سے کم ہے اب میں نے گیس کی قوت کو دو درجہ کم کر دیا ہے اور اس قسم کا تجربہ شاید اب نہ ہو"۔

کپتان نے اس حالت پر اظہارِ افسوس و ندامت کیا اور کہا کہ اگر جھٹکے سے کسی کو ایذا پہنچی ہو تو معاف کیا جائے اب ہمارا جہاز نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ سمت کا تعین چوں کہ فضاءِ بسیط میں نہیں ہو سکتی اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر؟ مگر ہاں چوں کہ پہلے روزانہ اب ہر ساعت میں چاند کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور درخشانی کم ہوتی جاتی تھی اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ چاند کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات غالباً ہر شخص کی سمجھ میں نہ آئے کہ قریب ہو جانے سے چاند کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہ آتی تھی لیکن میرے پاس ہی جب ایک امریکن نے اپنی بیوی کو سمجھایا تو مجھے بھی معلوم ہوا کہ چاند میں خود روشنی نہیں ہے بلکہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہے اور اسی وقت اس کا ظہور ہوتا ہے جب آفتاب کی کرنیں وہاں سے لوٹتی ہیں۔ پھر چوں کہ شعاعوں کا پورا پھیلاؤ ہمیشہ زیادہ دور پر جا کر ہوتا ہے اس لئے قریب سے پوری چمک کسی چیز کی نمایاں نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ سفر

اسی طرح جاری تھا اور کوئی خاص بات قابل ذکر سوائے اس کے نہ تھی کہ غذا بہت بڑھ گئی تھی۔ پہلے اگر ایک ڈبل روٹی کافی ہوتی تھی تو اب آٹھ درکار ہوتی تھیں۔ حالانکہ بھوک میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کشش قمر کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور ایک اونس زیادہ سے زیادہ ایک ڈرام رہ گیا تھا یعنی جو وزن ایک روٹی کا ہوتا تھا اس میں اب آٹھ روٹی چڑھتی تھیں۔ چوں کہ اس کا تجربہ پہلے ہو چکا تھا اس لئے ذخیرہ کافی تھا تاہم احتیاط کے ساتھ صرف کیا جاتا تھا یہی حال مشروبات کا تھا اور شراب کے دو ساغر پوری بوتل کے معنی رکھتے تھے۔

اب سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نلکیاں ناک سے علیحدہ کر کے رکھ دی گئی تھیں پھیپھڑا ساکن تھا اور قلب و نبض کے ضربات نہایت ہلکے ہو گئے تھے کیوں کہ کرۂ قمر فضا میں ہوا سے زیادہ ایک لطیف چیز اور ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کر کے خون میں مل جاتی ہے۔ اور رفتار خون کو بہت دھیما کر دیتی ہے، اس لئے خون کو صاف رکھنے کے لئے پھیپھڑوں کی ضرورت باقی نہیں رہی، اور وہ ایک "اثری عضو" ہو کر رہ گیا۔

سردی ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں ہر شخص نے اپنے لبادے، سمور کے کپڑے پہن لئے تھے لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت نسبتاً زیادہ مطمئن تھی کیوں کہ میں روئی

کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا۔ وہ لحاف کے اندر سردی کا گذر مشکل سے ہوتا تھا۔ سب لوگ مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اگر میں چاہتا تو اپنی ایک روئی کی مرزئی کے عوض ان کے سارے قیمتی کمبل لے سکتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب تغیر جو میں محسوس کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ جذباتِ محبت و ہمدردی میں کمی پیدا ہوتی جا رہی تھی اور وہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا، بہت کم یاد آتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس کے موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا تھا، بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں کا احترام یورپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت التفات باقی نہیں رہی ہے۔ نہ مرد عورت کے لئے اپنی جگہ خالی کرتا ہے، اگر جہاز کی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو مرد اٹھ کر اس کو سنبھالتا نہیں۔ اور بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا گفتگو کا تو خیر دروازہ ہی بند ہو گیا ہے کیوں کہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور نہ کانوں تک پہنچتا ہے۔ ادائے مطلب و اخذِ مفہوم کی صورت صرف یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کئے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک

غیر محسوس ذریعہ سے اس کا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سن کر کوئی بات سمجھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں۔ کامل ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر نہیں آیا۔ کیوں کہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں گیا تھا کہ اس کا وہی حصہ جو آفتاب کے مقابل رہتا تھا نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رخ ہمارے سامنے نہ تھا۔ یقیناً سفر کا یہ حصہ نہایت دلچسپ تھا کیوں کہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن اور منور عجیب و غریب بات معلوم ہوتی تھی۔ سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کئے جاتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی، بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی، اور محض رات ہونے کا علم اعصاب و دماغ میں ایک قسم کا تعطل پیدا کئے رہتا تھا۔

اس ایک ہفتہ کی رات میں عجیب و غریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ سب پسینے پسینے ہو گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف سینکڑوں غبارے جو یکسر شعلۂ جوالا نظر آتے تھے اُڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گذر رہے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ کپتان گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا جہاز اتفاق سے چاند کے نجیمات (چھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہنچ گیا ہے۔ جو ابھی تک گیس کی حالت میں مشتعل ہیں۔ اس کے چہرے سے تشویش

کے آثار پیدا تھے۔ لیکن اس نے انجن کی مخالف سمت کی قوت کو دور کر کے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ چاند کی طرف چلانا شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا کام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولے کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک گرمی کا اثر باقی رہا اور پھر مشکل سے نیند آئی۔

دوسرا تجربہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھا کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعتاً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور فضا میں بے شمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر انھوں نے نور کا جال بچھا دیا۔ معلوم ہوا کہ سب چاند کے شہاب ثاقب METEORS ہیں نظارہ اس قدر دل فریب تھا کہ ان کے خطرہ کا خیال بھی محو ہو گیا، اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹانیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے لحاظ سے ہزار من سے کم نہ ہو گی، جہاز کے عرشہ پر آ کر گریں اور کئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہو گئے۔ ان چٹانوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا، لیکن اس میں سپید نقطے اس قدر کثرت سے تھے جیسے گنی فول (مرغی) کے پر میں نظر آتے ہیں۔ ان کے بہت سے ٹکڑے کر کے بطور یادگار کے مسافروں کو تقسیم کر دیے گئے اور کچھ اس لیے محفوظ رکھ لیے کہ کرۂ ارض کے کسی عجائب خانہ کو دے دیئے جائیں گے۔

یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دل کش تھے۔ لیکن میرے لئے تو سب سے زیادہ پر لطف وقت وہ تھا جب پورے ۶۸ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوت بصارت آج از سر نو پیدا ہوئی ہے۔ سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرہ ارض پر دسمبر، جنوری میں محبوب ہو جاتا ہے۔

سب لوگ کمبل اتار اتار کر عرشہ پر آگئے اور بے اختیارانہ طور پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جس کا نام مس جوزف تھا میرے مراسم زیادہ ہو گئے تھے۔ یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھی اور ان کا خیال تھا کہ جب سیاحت قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان شوہر کی حیثیت سے انھیں مل جائے گا۔ چوں کہ مس جوزف اپنے جسم کے لحاظ سے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کر سکتی ہیں اس لئے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرد رات کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں۔ اسی سلسلہ نشاط میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا وزنی بید لے کر باہر پھینک دیا، یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کی طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن ان کی میری حیرت کی حد نہ رہی جب اس بید کو بجائے نیچے گرنے کے جہاز کے ساتھ ہی ساتھ بلکہ کچھ زیادہ تیزی سے اڑتے ہوئے دیکھا

اور تھوڑی دیر میں وہ جہاز سے آگے نکل گیا۔ چاند کی کشش نے اس کو ہم سے پہلے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ منظر اس قدر پر لطف تھا کہ مس جوزف نے اس کے بعد ایسی کئی چیزیں جو زیادہ ضروری نہ تھیں باہر پھینک دیں اور تماشہ کا لطف اٹھایا۔ جس وقت انھوں نے اپنی ٹوپی باہر پھینکی اور وہ ایک طائر کی طرح ساتھ ساتھ اڑنے لگی تو کپتان نے فوراً لمبے بانس میں بندھا ہوا ایک جال آگے کر کے ٹوپی کو پھر اندر کھینچ لیا۔ مس جوزف نے اس کو پھر فوراً باہر پھینک دیا اور کپتان نے پھر اسی طرح اس کو لے لیا۔ دیر تک یہ مشغلہ جاری رہا اور غالباً جاری رہتا۔ اگر فوراً ہی آفتاب غروب ہو کر رات کا سماں نہ پیدا کرتا۔ دن نہایت مختصر صرف چار گھنٹے کا تھا اور اس خیال نے کہ اب خدا جانے کتنے گھنٹوں کی رات شروع ہو رہی ہے سب کو افسردہ خاطر کر دیا۔ بجلی کی روشنی ہو گئی، کھڑکیوں کے پردے کھینچ لئے گئے، کمبل وغیرہ جسم پر ڈالے گئے اور بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر ہر شخص تیار ہو گیا۔ اس مرتبہ کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی اور کامل ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ہم سب سو کر اٹھتے تھے کہ دفعتہً روشنی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص یہ دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا کہ نیچے کی طرف بالکل وہی آثار نظر آ رہے ہیں جو کرہ زمین سے جدا ہونے کے بعد بلندی سے وہاں نظر آتے تھے۔ ہم میں سے بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ شاید پھر اپنی مادر گیتی کے آغوش میں پہنچنے والے ہیں کیوں کہ اونچے اونچے پہاڑ،

بڑے بڑے دریا، وسیع میدانوں اور دیواروں کا نظارہ بالکل وہیں کا سا تھا، لیکن جب کپتان سے معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار کرۂ قمر کی آبادی کے ہیں تو ہم لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

اب ہم کو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہم نیچے کی طرف جا رہے ہیں ورنہ اس سے قبل تو بلندی اور پستی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہا تھا الغرض دو گھنٹے کے اندر ہمارا جہاز کرۂ قمر کے اس وسیع میدان میں آہستہ آہستہ اُترا جسے وہاں کی زبان میں سوشان یعنی تختہ گل کہتے ہیں۔

یہاں تک تو سطح قمر تک پہنچنے کا حال تھا اب میں کچھ واقعات و تجربات وہاں کے بیان کرتا ہوں۔

کرۂ ارض میں سنا کرتا تھا کہ وزن نام ہے صرف کشش زمین کا اس لئے اگر کوئی کرہ زمین سے چھوٹا ہو تو وہاں کشش کی وجہ سے ہر چیز کا وزن کم ہو جائے گا یعنی اگر کوئی چیز کرۂ ارض میں ایک من کی ہے تو چاند میں پہنچنے کے بعد وہ صرف چند سیر رہ جائے گی۔

جہاز پر بھی اس کا علم ہو گیا تھا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے لیکن پوری حقیقت یہاں پہنچنے پر معلوم ہوئی۔ جس وقت ہمارا جہاز سوشان کے میدان میں اترا تو اس کی خفت وزن کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ سلنڈروں کی تمام قوت صرف کرنے پر بھی وہ اس طرح اترتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے بلندی سے کوئی پتنگ ٹوٹ کر جھپ کھاتی ہوئی نیچے اترتی ہے۔

جب ہم سطح قمر پر اُترے تو خیال تھا کہ یہاں انسانی آبادی نظر آئے گی

اور کچھ اسی قسم کے آثار حیات دکھائی دیں گے جیسے زمین پر نظر آتے ہیں۔
لیکن ہم لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بجائے انسانی آبادی کے
وہاں ہم نے ایک خاص قسم کے جانور دیکھے جو شکل و صورت میں تو انسان
سے بہت مشابہ تھے لیکن اعضا میں بہت فرق تھا۔ مثلاً یہ کہ بجائے دو
ٹانگوں کے ان کے صرف ایک ٹانگ تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ
خفت وزن کی وجہ سے انھیں اپنا جسم سنبھالنے کے لئے ایک ہی ٹانگ
کافی ہوتی ہے۔ جب یہ مخلوق چلتی ہے تو اپنی ٹانگ کو آگے نہیں بڑھاتی
بلکہ سارا جسم ایک ستون کی طرح اوپر کی طرف بلند ہوتا ہے پھر جس
طرف جی چاہتا ہے وہ اوپر ہی اوپر تیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لیکن
سو دو سو قدم چلنے کے بعد وہ پھر اسی ایک ٹانگ پر اسی طرح قائم
ہو جاتا ہے جیسے کوئی اوپر سے زقند بھر کر نیچے آیا ہو۔ اس لئے یہ
مخلوق بالکل چھلاوہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کی ٹانگ گاؤدم نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک لکڑی کی طرح برابر
ہوتی ہے جس میں کوئی جوڑ بھی نہیں ہوتا اور اسے جسم سے علیحدہ بھی
کر سکتے ہیں۔

یہ ٹانگ کمر سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور کمر نام ہے صرف ایک
باریک سی ہڈی کا۔ چوں کہ یہاں کی زندگی کے لئے ہوا کی ضرورت
نہیں ہے اس لئے پھیپھڑا بھی نہیں ہوتا اور غذا کے لئے معدہ بھی
نہایت مختصر ہے کیوں کہ صرف رقیق چیزوں پر گذر ہے جن کا فضلہ

پسینہ کی راہ سے نکل جاتا ہے اور اسی لئے امعار وغیرہ بھی نہیں ہے۔ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ناک بھی ندارد ہے اور سخت چیزوں کی غذا نہ ملنے کی وجہ سے دانت بھی نہیں ہیں۔ کانوں کے بجائے صرف ایک سوراخ پیشانی پر ہے اور دہن نام ہے ایک مختصر سے شگاف کا جس میں نہ زبان ہے نہ دانت۔ آنکھیں البتہ بجائے دو کے چار ہیں، دو رخساروں پر دو پشت پر ہاتھ انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں لیکن نہایت ہی کم زور۔ جنس کا فرق بھی ان میں نظر نہیں آتا اور باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سلسلہ تناسل اُن کے ہاں کس طرح قائم ہوتا ہے۔ یہ اُن کے ہاں کا راز ہے جو کبھی پر ظاہر نہیں کرتے۔ اُن کی تمام گفتگو سیٹیوں اور اشارات سے ہوتی ہے اور اُن کے جسم کے اوپر سنہرے بال جا بجا کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جو گفتگو کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والے پر سخت ہیبت طاری ہوتی ہے۔

جس وقت ہمارا جہاز پہنچا تو کثیر تعداد میں یہ جانور جو چاند کی اشرف المخلوقات ہونے کا فخر رکھتے ہیں چاروں طرف آ گئے اور لگے اپنے گول گول دیدے پھرا کر دیکھنے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر میں یہ لوگ لپٹ جائیں گے اور نوچ کر کھا جائیں گے کپتان نے جو یہاں کے حالات سے زیادہ واقف تھا اس نے کچھ اشارات کی مدد سے کچھ سیٹیاں بجا بجا کر کبھی بیٹھ کر کبھی اُٹھ کر اور طرح طرح کا

منہ بنا کر خدا جانے ان سے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے لیکن ہم نے
صرف اس قدر محسوس کیا کہ وہ دُور ہٹ گئے۔ غالباً اس نے
یہی کہا ہو گا کہ یہ لوگ ڈرتے ہیں، ذرا دور ہو جاؤ۔ ہماری ہم سفر
خاتونوں کی حالت نہایت خراب تھی۔ انہوں نے چہرے چھپا لئے
تھے اور مردوں سے لپٹی جاتی تھیں میں بھی جہاز کے اندر چلا گیا اور
دروازے بند کر کے سوچنے لگا کہ کتنی بڑی غلطی یہاں آنے میں کی ہے
اور اب بظاہر واپسی کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔

یہاں زمین بالکل کرۂ ارض کی طرح ہے لیکن فرق یہ ہے کہ
سبزہ اور درخت کا پتہ نہیں۔ جا بجا اونچی اونچی چٹانیں ضرور ہیں۔
جن سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے اور پانی کے اندر پتھروں پر چٹانوں
کی چوٹیوں پر، نشیب و فراز میں ہر جگہ برف کے بلورات۔
CRYSTALS مختلف ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں جو دور سے
ہزاروں کھلے ہوئے سفید پھولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اسی
لئے وہ میدان جہاں ہمارا جہاز اترا تھا تختہ گل کے نام سے موسوم
تھا حشرات کا یہاں پتہ نہیں ہے اور نہ چوپائے کہیں نظر آتے ہیں
طیور میں صرف ایک چیز بہ کثرت پائی جاتی ہے اور اس کو ہم
ہندوستان کے چمگادڑ سے تشبیہہ دے سکتے ہیں لیکن فرق یہ ہے
کہ چاند کا یہ جانور جسم و قامت میں بہت بڑا ہے اور اس کے پرو
بازو بھی بہت وسیع ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ چیز معنوی حیثیت سے تو یہاں کی اجنبیت تھی اور ظاہری اعتبار سے یہاں کی بڑھی ہوئی سردی۔ آفتاب چمک رہا تھا، لیکن بجائے گرمی کے اور خنکی برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا، ہاتھ پاؤں کی ٹھٹھرن کسی طرح نہ جاتی تھی ایک منٹ تک مسلسل آگ کے اندر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

یہاں نہ کوئی بازار ہے، نہ کوئی شہر، یہاں کی مخلوق غاروں میں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ آپس میں نہ کوئی خاص اختلاط ہے اور نہ ایسی منافرت ایک ایک غار میں چار پانچ کی جگہ ہوتی ہے اور شب دروز میں مشکل سے چند گھنٹوں کے لئے باہر نکل کر چشموں پر جاکر پانی پی لیتے ہیں اور پھر وہاں جاکر پڑ رہتے ہیں۔

یہاں کا سب سے زیادہ دل کش مقام ایک تو وہ وسیع حصہ سمندر کا ہے جو بالکل خشک ہو گیا ہے۔ اور جس میں اتنے بڑے بڑے غار پائے جاتے ہیں کہ آج تک اُن کی تھاہ نہیں ملی اور نہ یہ پتہ چلا کہ اُن کے اندر کیا ہے۔ دوسری تفریح کی جگہ سمندر کا وہ لبریز حصہ ہے جہاں برف کی ہزاروں چادریں تیرتی پھرتی ہیں اور یہاں کی مخلوق سوار ہو کر ان سے جہازوں کا سا کام لیتی ہے اس کے اندر ایک خاص قسم کی مچھلی بالکل چاندی کی سی پائی جاتی ہے۔ اس کا شکار کھانے کی غرض سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی چربی نکال کر جلاتے ہیں اور اس کی کھال کو اوڑھتے ہیں۔

سہ پہر کو جب ہم لوگوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا، اور اس خیال سے خیموں سے باہر نکلے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ ہر شخص کے لئے ایک چھوٹی سی گاڑی چھینکے کی طرح تیار تھی جس میں چار چار وہی چمگادڑ جتے ہوئے تھے اور ایک چلانے والا اسی عجیب الخلقت قسم کا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھ کر سخت وحشت زدہ ہوا اور میں نے اس پر بیٹھنے سے انکار کیا، لیکن پیچھے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ تین چار آدمی ایک ایک ٹانگ سے کودتے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنے اشاروں، سیٹیوں، آنکھ کی گردشوں اور ڈراؤنی شکلوں سے ایسا ڈرایا کہ میں بے اختیارانہ اس چھینکے کے اندر گر پڑا اور چمگادڑ اس کو لے کر اوپر اڑ گئے میں چیخ رہا تھا، چلّا رہا تھا لیکن اس جانور پر کوئی اثر نہ ہوا اور میں لٹکا ہوا اوپر فضا میں چلا جا رہا تھا۔ اگر اطمینان تھا تو صرف اس قدر کہ میرے اور ساتھی بھی اسی طرح آگے پیچھے چھینکوں میں لٹکے چلے آ رہے تھے۔

اندازاً دو گھنٹہ کے بعد ہماری سواری پھر نیچے کی طرف مائل ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا کر ٹھہر گئی۔ میرے ساتھی بھی تھوڑی دیر میں وہیں آ گئے، یہاں پہلے سے ایک جماعت .... سر دل پر اسی مچھلی کی کھال کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہاتھوں میں پتھر کے نوک دار ٹکڑے لئے موجود تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں کے فرماں روا کے پاس جا رہے تھے اور یہ سب اس کے سپاہی تھے جو

ہمارے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے۔

انھوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کر لیا اور ہم لوگ کملوں سمور کے ٹکڑوں میں اپنے ہاتھ لپیٹے ہوئے آگے بڑھے۔ اب شام ہوگئی تھی اور آفتاب کی شعاعیں پہاڑوں کی سفید چوٹیوں، میدانوں کی برفانی بلورات اور وادیوں کی شفاف چشموں پر پڑ کر بے شمار قوس قزح پیدا کر رہی تھیں، یہ منظر یقیناً اس قدر دلکش تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں اپنی تمام مصائب بھول گیا اور میرے ساتھیوں میں سے بھی ہر شخص محو ہو کر رہ گیا۔

چار فرلانگ کے بعد دفعتہً ہم کو ٹھہر جانا پڑا کیوں کہ یہاں سے اب شاہی محلات کے حدود شروع ہوتے تھے۔ میں نے خدا جانے دل میں کیا جغرافیہ ان محلات کا قائم کیا تھا، لیکن یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شاہی محلات عبارت ہیں صرف ان وسیع غاروں سے جو کھود کھود کر پہاڑوں کے اندر بنائے گئے ہیں۔

ان غاروں کا سلسلہ اس قدر وسیع و پیچیدہ ہے کہ اچھی خاصی بھول بھلیاں ہو گیا ہے اور اگر کوئی واقف اتصال نہ ہو تو پھر ایک مرتبہ جانے کے بعد باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک غار کے دہانہ پر پہنچ کر ہم لوگ ٹھہر گئے اور اندر سے کئی آدمی مشعلیں لئے ہوئے نمودار ہوئے جو سپاہی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ باہر ہی رہ گئے۔ اب ہم ایک سرنگ کے اندر جا رہے تھے جس کی چھت سے سردپانی کے قطرے ٹپک رہے تھے

اور سردی کا یہ عالم تھا کہ ہڈی تک میں درد محسوس ہونے لگا تھا یہ سرنگ ایک فرلانگ کی تھی، اس سے نکل کر پھر روشنی میں آ گئے لیکن اب چٹانوں کا اتنا ہی سلسلہ سامنے تھا۔ اس کے بعد پھر دوسری سرنگ رہی۔

الغرض اسی طرح یکے بعد دیگرے پیچ در پیچ سرنگوں اور چٹانوں سے گذرتے ہوئے ایک گھنٹہ کے اندر ہم خاص قصر شاہی کے اندر پہنچے جہاں بہت سی مشعلیں روشن تھیں۔ یہ قصر شاہی صرف ایک وسیع دالان سا تھا جو پہاڑ کھود کر بنایا گیا تھا۔ ایک سنگین تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا جس کے جسم پر بہت سی سیپیاں چپکی ہوئی تھیں اور سر کے تاج میں جو اسی مچھلی کی کھال کا تھا بہت سے رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے، اس کی صورت بھی ویسی ہی بھیانک تھی، یہ اس وقت اپنی ٹانگ الگ کئے ہوئے ایک مضغہ گوشت کی طرح تخت پر پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ قریب پہنچکر کھڑے ہو گئے اور اس نے مخصوص اشارات سے ہمارا خیر مقدم ادا کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سنگین پیالوں میں شربت کے قسم سے ایک چیز آئی جس کو ہم لوگوں نے پیا۔ اس کے پینے سے ہم لوگوں کی ساری تھکن دور ہو گئی اور سردی کی شدت بھی کم محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ خاص چشمۂ شاہی کا پانی تھا جس میں عجیب و غریب اثرات پنہاں تھے۔

اس بادشاہ کے درباری بھی سب ایک وضع اور صورت کے تھے اور اس وقت ان سب کی سیٹیوں اور اشارات نے ایک خاص قسم کا ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

رات کو ہم لوگ یہیں رہے اور ایک غار کے اندر رہ کر صبح کر نی پڑی۔ جب دوسرے دن آفتاب ذرا بلند ہوا تو پھر بادشاہ کا سلام ہوا اور انھیں سرنگوں سے گذر کر چھینکوں میں بیٹھے، اس مرتبہ یہ چھینکے زیادہ بلند نہیں گئے بلکہ پہاڑوں کی سطح کے قریب قریب روانہ ہوئے۔ مقصود یہ تھا کہ ہم لوگ سیر کرتے ہوئے جائیں۔ جب اپنے خیموں کے محاذ میں پہنچے تو یہ چھینکے دفعتہً بہت بلند ہو گئے اور ڈرائیور نے آہستہ سے میرے بازوؤں میں چمڑے کے دو پر جو لپٹے ہوئے تھے کسی چیز سے چپکا کر نیچے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد صرف یہ مجھے اتنا ہوش ہے کہ چھینکے سے گرنے کے بعد وہ دفعتہً کھلنے شروع ہوئے، اور میں طائر کی طرح آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا، لیکن دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی برداشت نہ کر سکا اور سر چکرا تے چکراتے دفعتہً میں نے ایسا محسوس کیا کہ کسی چٹان سے جا کر ٹکرا گیا ہوں۔

آفتاب بہت بلند ہو چکا تھا اور میری چھوٹی بچی مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھی اور سامنے کرسی پر بیوی بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھیں اور وہ پوچھ رہی تھیں کہ آج سوتے میں تم نے چیخ کیوں ماری۔ میں ان کو دیکھ کر سہما جا رہا کہ یہ بھی کہیں انھیں چاند والوں میں سے کوئی نہ ہوں لیکن جب ان کی دونوں آنکھیں، دونوں کان اپنی اپنی جگہ پر ثابت و سالم نظر آئے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور بولا کہ چاء پی لوں تو بتاؤں کہ کتنی بڑی مہم سر کر کے آیا ہوں۔

رشید احمد صدّیقی

آپ قصبہ منڈیا ہو ضلع جونپور کے رہنے والے ہیں ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ آج کل علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں اور اپنا تمام وقت ادبی کارناموں علمی مشغلوں اور درس و تدریس میں صرف کرتے ہیں۔ سنجیدگی ان کے مزاج میں زندہ دلی اور شگفتگی ان کی طبیعت میں پائی جاتی ہے اسی لئے ان کی تحریروں میں کہیں سنجیدگی متانت اور کہیں ظرافت اور کہیں دونوں مل کر ادبی شان پیدا کر دیتی ہیں۔

رشید صاحب کے مضامین میں ظرافت کے ساتھ ساتھ ایک زبردست طنز بھی پایا جاتا ہے۔ ادبی۔ سیاسی اور اخلاقی مضامین میں جہاں جہاں انھوں نے طنزیہ نکات لکھے ہیں وہ دلیل ہیں گویا اس بات کی کہ طنز نگاری انھیں کا حصّہ ہے۔ وہ دورِ حاضر کے ممتاز ترین انشا پردازوں میں ہیں اور ظرافت نگاری اور طنز نگاری کی محفل میں اول صف میں ان کی جگہ ہے۔ وہ ایک بلند پایہ نقاد بھی ہیں اس سے آپ کی کاوشِ علمی کا پتہ چلتا ہے۔

رشید صاحب کی تصانیف میں "مضامین رشید" "خنداں" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہیں اور "گنج ہائے گراں مایہ" ان کے سوانحی مرقعے ہیں اور مزاحیہ نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ چوتھی کتاب ان کی "طنزیات اور مضحکات" ہے ان میں انھوں نے مزاح نگاری کی تاریخ لکھی ہے یہ ہندوستانی اکاڈمی سے شائع ہوئی ہے

دعوت

ایک مثل مشہور ہے "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ مثل بھی عام ہونی چاہیے "مجھے دعوتوں سے بچاؤ" گو دوستوں سے بچنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ دعوتوں سے بھی نجات مل جائیگی۔

بھوک کی مانند دعوت کا بھی یہ حال ہے کہ اس کا نہ کوئی وقت مقرر ہے اور نہ موقع کسی نے ٹھیک ہی کہا ہوگا۔

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانہ میں بھوک
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں بھوک
بھوک ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے بھوک کے آغوش میں

تیوہار ہو تقریب ہو، کوئی مہمان آیا ہو، کوئی چل بسا ہو، رقعۂ دعوت بہرحال موجود ہے ماحضر موجود ہے! ایک بزرگ نے تو جوش میں آکر اس کی بھی فرمائش کر دی۔

براہ کرم تناول ماحضر فرمائیے"

دعوت میں نہ جائیے تو بے توجہی کی شکایت، جائیے تو معدہ اور عاقبت دونوں خراب۔

مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے جس جس قسم کی اور جس جس موقع پر دعوت

کھائی ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ سب سے پہلی دعوت مجھے خوب یاد ہے۔ گو اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ میرے کسی بزرگ کی دعوت رہی ہو اور وہ مجھے اسی اصول پر بن بلائے ساتھ لے گئے ہوں جس اصول پر ریل میں کرایہ ادا نہیں کرنا پڑتا۔ یعنی معصوموں کے لئے نہ کرایہ ادا کرنے کی ضرورت ہے اور رقعہ دعوت کی۔

بعض ریلوے لائنوں کا تو مجھے حال معلوم ہے کہ وہاں فی گاڑی دو سادھو کے حساب سے مفت سفر کیا جا سکتا ہے۔ ادھر کوئی ٹکٹ کلکٹر اس لائن پر مامور ہوئے انھوں نے ایک بزرگ کو بے ٹکٹ سفر کرتے پکڑا تو انھوں نے نہایت گھور کر عارفانہ ڈپٹ کے ساتھ کہا ابھی شراپ دوں گا بھسم ہو جائے گا جانتا نہیں فی گاڑی دو سادھو! بیچارے ٹکٹ کلکٹر ایسے مبہوت ہوئے کہ گاڑی کے نیچے کٹتے کٹتے بچے۔

ہاں تو پہلی دعوت مجھے ایسے صاحب کے ہاں کھانی پڑی جو گیڑے بنتے تھے۔ غازی میاں کے معتقد تھے۔ راہ نجات پڑھتے تھے اور کوئین بیچنے میں سراپا جھکے تھے۔ ساری بستی مدعو تھی۔ مئی کا مہینہ اور دوپہر کا وقت مکان و میدان کا کوئی نشیب و فراز ایسا نہ تھا جہاں کھانے والے نہ بیٹھے ہوں۔ فرش و دسترخوان کا وہاں کوئی دستور نہ تھا جس کو جہاں جگہ مل گئی بیٹھ گیا' ایک نیب کی جڑ پر میں بھی بیٹھ رہا۔ ایک ہاتھ میں گرم گرم تنوری روٹی دیدی گئی' مٹی کے ایک برتن میں زمین پر سالن رکھ دیا گیا بھشتی نے مشک سے تام چینی کے گندے شکستہ گلاس میں پانی پلانا شروع کر دیا۔

سامنے ایک نیاز مند کتّے صاحب بھی موجود تھے۔ دم ٹانگوں کے درمیان خود دو زانو بیٹھے ہوئے نظریں نیچی۔ بہت کچھ بھونکے۔ چہرہ اور جسم پر ہمسایہ اہمسا کے غیر فانی نقوش جن پر مکھیاں مصروف غزل خوانی اور بحیثیت مجموعی داغ کا ایک مصرعہ

"نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے"

پاس ہی ایک بوڑھے کھانستے جاتے تھے۔ کھاتے جاتے تھے اور خلال کرتے جاتے تھے ناتی گودمیں پوتا کندھے پر۔ پوتے نے ایک ہڈی کتے کے سامنے پھینک دی۔ اب معلوم ہوا کہ ایک اور کتے صاحب کہیں قریب ہی مراقبہ میں بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے یک لخت غرا کر جست کی اور آن میں دادا نانا پوتا ناتی کے پورے شجرۂ نسب کو ڈھاتے گئے۔ خلال دادا یا نانا کے گلے میں جا پھنسا اور پوتے ناتی میرے سالن میں آرہے۔ ایک ہڑ بونگ مچا۔ مشہور ہوا کہ جتھو دادا پر غازی میاں آگئے۔ سارے کھانے والے بھاگ کھڑے ہوئے۔

یہ تو میرا ایام جاہلیت کا قصہ تھا۔ ہوش سنبھالا تو ایک مشہور شہر میں ڈیپوٹیشن پر جانے کا اتفاق ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ شام کو وہاں کی مشہور مسجد کے امام صاحب کے ہاں افطار پر ہم سب مدعو تھے جہاں ایک ہجوم تھا۔ ہمارے سامنے بھی افطاری رکھ دی گئی۔ اب ہم سب نے مشکل سے دو ایک لقمے زد کئے ہوں گے کہ ایک حملہ ہوا۔ چند سورما ہم پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ سامنے تھا اُسے چٹ کر کے آگے بڑھ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہاں کا یہی

دستور تھا کہ جو چاہے جس کے سامنے سے افطاری اُچک لے ایسا کرنے سے میزبان کو ثواب ملتا ہے۔ ہمارے ساتھ ایک روہیل کھنڈی پٹھان طالب علم تھے وہ بڑے متحیر ہوئے۔ ان کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس واقعہ کو نظرانداز نہ کریں گے۔ جب لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور ہر شخص نیت باندھ چکا تو انھوں نے اپنی ٹوپی تو جیب میں رکھی اور سامنے سے ایک نمازی کی پگڑی اچک کر اپنے سر پر رکھ لی اور سلام پھیرتے ہی اُسے چھت سے نیچے پھینک دیا جہاں ہزاروں فقیر ٹوٹ پڑے اور آناً فاناً پگڑی کا تبرک تقسیم ہو گیا۔ جھگڑا بڑھا تو انھوں نے فرمایا ہماری طرف دستور ہے کہ نماز میں جس کا عمامہ چاہے اچک لے۔ نماز کے بعد وہی عمامہ غربا میں لٹوا دیا جاتا ہے، اس عمامہ کے جتنے پُرزے ہوتے ہیں اتنے ہی ہزار محل اور باغات امام کو جنت میں ملتے ہیں۔ اس کی دھجیاں بچّوں کے گلے میں ڈال دی جائیں تو ام الصبیاں نہیں ہوتا جوان باندھ لیں تو اُن پر جیل خانہ حرام ہو جاتا ہے۔ بوڑھے استعمال کریں تو آنتیں اُترنے سے محفوظ رہتی ہیں۔ بہرحال امام صاحب کے کہنے سننے سے معاملہ رفت گذشت ہو گیا۔

رات کو دعوت تھی۔ سارے مہمان دو زانو بیٹھے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مارسڈن صاحب کی تاریخ ہند میں ٹھگوں کا گروپ ہے۔ ہم سب بھی بیٹھ گئے۔ ایک بڑی سینی میں بریانی کا اہرام مصر بنا ہوا تھا جس کے اوپر ایک دیگچی شوربے کی انڈیل دی گئی۔ لوگ سینی پر ٹوٹ پڑے

اور براہ راست دست بدہن ہو گئے۔ دست بدہن کو آپ محض "ہینڈ ٹو ماؤتھ" کا ماحضر تصور فرمائیں۔ ہمارے روہیل کھنڈی دوست چپ چاپ بیٹھے رہے میزبان تو انھیں دیکھ کر خاموش رہے لیکن ایک بزرگ جن کی داڑھی چاولوں کی مالا بن گئی تھی اور شوربا گنگا جمنی خضاب کی بہار دکھا رہا تھا قاب سے سر اٹھائے بغیر بولے۔ کھاؤ سیٹھ صاحب کھاؤ نہیں تو ایک غریب کا مال ضائع ہوگا۔ دوست بولے بالکل درست لیکن دوسرے غریب کی جان بھی تو ضائع ہو گی۔

وہاں کے زمانہ قیام ہی میں ایک اور جگہ سے دعوت نامہ آیا ہمارے میزبان وہاں کے معزز اور دولت مند ترین لوگوں میں سے تھے۔ میزبانی کے فرائض خاتون خانہ ادا کر رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں پہنچے تو دن کو تارے نظر آنے لگے۔ ایسی خوبصورت قیمتی پر تکلف اور نایاب چیزیں ایک ساتھ کب دیکھنی نصیب ہوئی تھیں۔ البتہ ان کا تذکرہ میلادون میں سنا تھا یا طلسم ہوش رُبا میں پڑھا تھا۔ مالک مکان سے زیادہ پرشوکت اور شیر افگن نوکر، نوکرنیاں تھیں۔ یہ شیر افگن نور جہاں کے پہلے شوہر نہیں بلکہ ہمارے اردو شعراء کی اولاد قسم کی چیز ہے۔ کس کی تعظیم کیجیے اور کس کی تعظیم لیجیے۔ کھانے کے کمرہ میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ شاید دنیا کے سب سے بڑے آدمی کا سب سے بڑے شفاخانہ میں آپریشن ہونے والا ہے ہر طرف سوائے صفائی اور سامان جراحی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اول تو کھانے کا گانگ بجا تو ہم نے

سمجھا ہماری روح قبض کرنے کا کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے۔ میز کے قریب آئے تو ایک مثنوی زہر عشق قسم کی صنف نازک نے ہمارے بیٹھنے کی کرسی کھینچی معاً خیال آیا کہ آگے بڑھ کر کہوں "اے قبلہ یہ آپ کیوں کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں لیکن سیاستِ دربان سے ڈرا اور خاموش رہ گیا جب ہم میز سے متصل ہوئے تو اس نے کرسی ہم سے متصل کر دی۔ میں آداب سے واقف نہ تھا اور پھر کچھ سہما ہوا بھی تھا اسی لئے کرسی پر پورا بوجھ دینے کے بجائے اپنی ہی پاؤں پر زور دیئے رہا۔ بس یوں سمجھ لیجئے گویا کوئی نہایت سبک سوار خاکی گھوڑے پر بیٹھا ہوا روانہ ہونے کے اشارے کا منتظر ہو۔ آپ یقین مانئے اگر اس دوران میں کہیں وہ گانگ ایک دفعہ اور بج جائے تو روح پرواز ہوتی یا نہ ہوتی ہمارا جسم ضرور پرواز کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ کھانا آیا اور آتا رہا لیکن یقین مانئے۔ کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ کھانا ایسے ایسے یونیفارم یا لباس فاخرہ یا ملبوسات عروسی میں لایا جاتا تھا کہ یہ طے کرنے میں دشواری ہوتی کہ ان پر حملہ کیا جائے یا ان کی عبادت کی جائے یا پھر کھڑے ہو کر قومی ترانہ گایا جائے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ کس آلہ سے کس چیز پر حملہ کیا جائے اس لئے کہ جان لینے کے لئے تو آپ آزاد ہیں جو آلہ چاہیئے شوق سے استعمال کیجئے لیکن کھانوں کے لئے تو مخصوص آلات مقرر ہیں۔ تیسری مصیبت یہ کہ جو کھانا پیش کیا جارہا تھا اس کے دوسرے عزیز اقارب نہ معلوم کون کون اور تھے جن کی عدم موجودگی

میں کھانے کو ہاتھ لگانا بڑا گنوار پن ہوتا۔ میزبان خاتون کو مسکرانے اور خواہ مخواہ اخلاق برتنے سے فرصت کہاں کہ وہ کچھ بتائیں یا ہم پوچھ سکیں بیروں کو دیکھئے تو زرہ بکتر اور چار آئینے لگائے ہوئے اس طور پر مصروف کار تھے جیسے بعض نالائق اور بد دماغ، امتحان کے ہال میں امیدواروں کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس قسم کے بیروں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو کچھ ایسا وہم سا ہونے لگتا ہے کہ یہ کہیں نہ کہیں اپنے یونی فارم یا بیٹی چھوٹی میں کوئی پیش قبض بھی چھپائے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی خادمہ بشکل مخدومہ آجاتی تھی اور ہم بربنائے سراسیمگی یا دوراندیشی یہ سمجھ کر کہ یہ بھی میزبان قسم کی کوئی چیز تھی یا آج نہیں کل اس رتبہ پر فائز ہوں گی ہمیشہ تعظیم دیتے یا بیوقوفوں کی طرح مسکرانے کے لئے تیار رہتے کھانا تھا کہ چلا ہی آتا تھا، ہم نے بھی چھری اس طور پر پکڑ رکھی جیسے کسی قسم تراش چاقو سے گینڈے کی قربانی کرنے والے ہیں۔ کانٹا ہمارے ہاتھ میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پلیٹ پر کوئی کیکڑا مسلط ہے۔

خدا کر کے کھانا ختم ہوا، کافی آئی بغیر دودھ یا شکر کے، بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے تمباکو کا گل میں کر گرم پانی ملا دیا گیا ہے یا نادرشاہ کے اصلاح معدہ کے لئے التماس کا مسہل جام بلوریں میں پیش کیا گیا ہے مشکل یہ ہے کہ کافی سے انکار کیجئے تو بعض میزبان اس طور پر خفا ہوتے ہیں جیسے ریڈیو والوں کو آپ کی تقریر دس دن پہلے نہ پہنچ جائے یا صاف نہ لکھی ہو تو یہ دل ہی میں کوستے ہوئے براڈکاسٹ کرتے ہیں۔

اب فرض کیجئے کسی رئیس کے ہاں دعوت ہوئی وہ کھانا اس طور پر کھلائے گا گویا مہمان کے سات پشت تک کو نواز ڈالا' قورمہ ہر دعوت میں ملتا ہے اور معمولی سے معمولی لوگ بھی اپنے گھروں پر کھاتے ہیں لیکن رئیس کے یہاں کا قورمہ کچھ اور ہی چیز ہوتا ہے۔ ایک خاص انداز سے فرمائیں گے' مولانا کمئے قورمہ بھی شوق فرمایا' جی ہاں شکریہ ماشاء اللہ۔ فرمائیں گے صاحب ایسا حلوان دہلی بھر میں نہ ملے گا۔ بادام پر پلا تھا۔ ذرا بوٹی کی خستگی پر نظر رکھئے۔ سبحان اللہ کیوں نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ہاں ہاں خوب کھائیے۔ بہت ہے۔ جی ہاں خوب سیر ہو کر کھایا۔ نہیں نہیں آپ تکلف کرتے ہیں۔ فلانے چلو' مولانا کو قورمہ اور دو۔ لیکن فلانے کو پکاریں گے اور قورمہ کا آرڈر اس طور پر دیں گے گویا مولانا کو ٹھوا دینے کا ارادہ ہے' قورمہ پلیٹ میں ڈال دیا گیا اور مولانا کو قورمہ سے نفرت ہونے لگی۔ ارشاد ہوگا مولانا یہ باورچی اب دہلی میں اکیلا رہ گیا ہے اس کا دادا معمولی حجام تھا' میرے والد نے اس کو کھانا پکانا سکھایا وہ خود کھانے کے بڑے شائق تھے اب اس کا ثانی دور دور نہ ملے گا بس مولانا قورمہ کھا لیجئے یہ چیز اب معدوم ہوتی جاتی ہے غرض مولانا کو اس شفقت اور تپاک سے کھلائیں گے گویا اپنے والد مرحوم کے فاتحہ کا کھانا کسی نابینا حافظ کو کھلا رہے ہیں۔

دوسری آفت ملاحظہ ہو۔ بعض میزبان حماقت اور محبت کے سلسلے میں اصرار کرتے کرتے کھانا آپ کی پلیٹ میں ڈال دیں گے اور فرمائش کریں گے

کھائیے میرے سر کی قسم کھائیے۔ حالانکہ اس وقت جی یہی چاہتا ہے کہ پلیٹ سر پر مار دیجئے اور گریبان پھاڑ کر کہیں بھاگ جائیے، ایسی دعوت سے مجھ کو قلبی نفرت ہے جہاں میزبان بار بار کھانے کے لئے اصرار کرے اور اپنے ہاتھ سے میری پلیٹ میں کھانا رکھ دے اور صرف یہ کہتا رہے آپ کو کھانا پسند نہیں آیا آپ کے لئے کچھ انتظام نہ ہو سکا بھائی جلدی میں یہی دال دلیا ہو سکا۔ آپ نے کچھ بھی تو نہیں کھایا حالانکہ اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ میں یہ کہوں کہ ایسا کھانا مجھے تو کیا میری سات پشت کو نصیب نہ ہوا اور نہ ہوگا اور آپ نے جس مروت اور ایثار کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔

اس کے علاوہ بعض دعوتوں میں عجیب عجیب قسم کے بدتمیزوں سے سابقہ پڑتا ہے بعض کھانا نہیں کھاتے منہ میں جوتیاں ٹھونستے ہیں کچھ ایسے ہیں جو ساری انگلیاں سالن میں ڈبو دیں گے اور منہ میں لقمہ کی پذیرائی اس طور پر کریں گے جیسے سرکس کے گھوڑے کو چابک لگاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بدحواس ہو کر بہت زیادہ پلیٹ میں لے لیں گے تھوڑا کھائیں گے اور بقیہ کو گھنگھول کر چھوڑ دیں گے۔ ڈونگے میں سے بوٹیاں چمچے سے نکالنے کے بجائے ان کو ٹٹول ٹٹول کر نکالیں گے کبھی پلیٹ میں نکالی بوٹیوں کو پھر ڈونگے میں ڈال دیں گے پانی پئیں گے تو معلوم ہوگا گویا بھری بوتل حلق میں انڈیلی جارہی ہے اور گلے سے قلقل مینا کا کام لے رہے ہیں۔ کچھ لوگ چپاتی کے حاشئے توڑ توڑ کر دسترخوان پر انبار

لگا دیں گے سنی ہوئی انگلیاں روٹی سے پوچھیں گے اور ڈکار اس طور پر لیں گے گویا اس خوبصورت آواز کے تمام لوگ منتظر تھے۔

کچھ اس طور پر کھائیں گے گویا اپنے گھر کھانے کو نہیں ملتا۔ دوسروں کے دسترخوان پر نازک مزاجی یا بد دماغی کا ایسا ثبوت دیں گے گویا وہ بیک وقت اردو کے کوئی حق بخشوائے ہوئے شاعر بھی ہیں اور نالائق افسر بھی!

اور خدا اس دعوت سے بھی ہر بھلے مانس کو بچائے جس میں تقریر کی جانے والی ہو لیکن مقرروں میں آزادوں کی محفل اور شرفا کی مجلس میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ ہو!

پطرس بخاری

ان کا اصلی نام احمد شاہ بخاری ہے وطن پنجاب کی سرزمین ہے تعلیم سے فراغت حاصل کرکے کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ دنیائے ادب میں پطرس کے نام سے مشہور ہیں بے حد زندہ دل اور شگفتہ طبع آدمی ہیں۔

پطرس نے اردو زبان میں صرف ایک چھوٹی سی کتاب آٹھ دس مضامین کے مجموعہ کی لکھی ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ اسی چھوٹی سی کتاب نے ان کو بہت بڑا آدمی بنا دیا ہے اور اردو ادب میں ان کو ایک مستقل جگہ مل گئی ہے اور ممتاز ترین مزاحیہ نگاروں میں آپ کا نام پہلے لیا جاتا ہے۔ آپ کی تحریر میں شوخی شگفتگی اور روانی ہر جگہ نظر آتی ہے پلاٹ تیار کرکے ان میں افسانے کا رنگ پیدا کرنا پھر اس میں سنجیدہ ظرافت کی چاشنی دے کر اپنے مخصوص انداز سے بیان کرنا دلچسپ اور معیاری ہے۔ ان کے مضامین میں کافی انفرادیت ہے۔ سب سے بڑی خوبی ان کی سنجیدہ ظرافت ہے ان کا مذاق نہایت مہذب ہے ان کی تحریر طبیعت پر بار نہیں ہوتی کیونکہ نہ اس میں آورد ہے اور نہ تشبیہات اور استعارات

کے پر دے۔ نہ اصل مضمون سے ہٹتے ہیں اور نہ کوئی ان میل
بات لکھی ہے چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں مگر حد درجہ پر مغز غرض
بہ حیثیت ماہر زبان اور صاحب طرز کے ان کا مرتبہ بہت بلند
ہے۔ یہ ظریفانہ طبیعت اور ادبی ذوق رکھنے والوں کی بدقسمتی
ہے کہ ان کی ایک کتاب تشکل کر رہ گئی اور اب آج کل تو ان
کو کتاب لکھنے کا تو در کنار بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔

شوکت تھانوی نے اُن کے مقابلہ میں اپنا وجہ دستگیر کرنے
سے انکار کر دیا ہے۔

ہاسٹل میں پڑنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔ اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گذارنی پڑی۔ ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔ خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی۔ اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے۔ دراصل لامحدود قابلیت کا مالک ہے۔ جس کی نشو و نما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس لئے وظیفہ کا نہ ملنا بھی

خصوصاً اُن رشتہ داروں کے لئے جو رشتہ کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے۔ فخر و مباہات کا باعث بن گیا اور مرکزی رشتہ داروں نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی اس لئے بلا تکلیف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانب دار اور دیانتدار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کر دیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم۔ فوٹوگرافی۔ تصنیف و تالیف۔ دندان سازی۔ عینک سازی۔ ایجنٹوں کا کام۔ غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالا نشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تھوڑے عرصہ کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی ہمیں تاک ...

نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے
کو لاہور نہ بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا لیکن انھوں نے تو تفصیلات میں
دخل دینا شروع کر دیا اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے
ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل
گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان۔ اس
پر انھوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین
سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبا باہر
کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر اُن کی پوری طرح نگہداشت نہ
کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی
نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوئے خانے میں ہزاروں
روپئے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا پھر فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے
سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل
کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور مگر ہاسٹل ہرگز
نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک مگر یہ نامعقول۔ انھوں
نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی
جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے تو کسی ترکیب کا سوجھ
جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض
کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا

سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں اُن کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اُٹھ رہا تھا۔ وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا۔ یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا۔ اور تعلیم کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آنا۔ کیوں کہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتہ میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔

سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے، لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی۔ ایک فراخی۔ ایک وارفتگی ہونی چاہئے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ناممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم موقع ہے۔ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا۔ ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا۔ ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے از حد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی اُن پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بچارا ہاسٹل کو واپس آرہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آگئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا صرف دو منٹ بس صاحب۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوا لیا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا اور مہینے بھر کے لئے اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سُن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہوگئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامتِ اعمال بچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کے بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر کو سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ اُن کے روپے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپیہ اور دو روپیہ کے بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیئے تھا۔

انھیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گذر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آکر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آگئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلیلیں ہم نے پیش کی تھیں۔ وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کہ ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت بننے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ جانتا ہے کہ "والدینی اغراض" کے لئے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے

میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتہ اُن کے نام منی آرڈر چلا آتا ہے۔

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار" ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا۔

"تمہارا شخصیت سے آخری مطلب کیا ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں میں نے کہا "دیکھئے نا۔ مثلاً ایک طالب علم ہے وہ کالج میں پڑھتا ہے اب ایک تو اُس کا دماغ ہے۔ ایک اُس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے۔ نہ دماغ سے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت

——— نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیے ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے ——— لیکن پھر بھی اگر ہمہ بھی تو بھی ——— گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ——— ٹھہریئے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کے بجائے والد نے مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہیے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے "کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا "چال چلن ہی کہہ لیجیے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن اچھا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟"

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا "جی ہاں۔"

یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند

ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں سچ زیادہ بولتے ہیں۔ نیک زیادہ ہوتے ہیں"

میں نے کہا "جی ہاں"

کہنے لگے "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اے کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا لیکن اگلے سال گرمی کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقع زیادہ ملتے رہتے ہیں اور ان بیرونی اوقات کالج ملاقاتوں سے انسان بہت کچھ سیکھ جاتا ہے اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب وہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔

نکمیاں اور مچھر مارنے کے لئے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میری تقریر دں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلہ پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگایئے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت میری رائے کی وہ پہلی جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔ میں پہلے سال بی۔ اے میں کیوں فیل ہوا۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔ اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا اس لئے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہو گئے۔ بہر حال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا۔ لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہا ہو۔ نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)۔

اب جب ہم بی۔ اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ ہم بی۔ اے میں ریاضی لیں گے اس طرح کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لئے فالتو کام کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی۔ اے میں ہمارے مضامین انگریزی۔

تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضامین پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تینوں مضامین کو دیتا آپ یقین مانئے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ نہ دیتا۔ بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کماحقہ توجہ نہ کر سکا کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا۔ لیکن بی اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔ کیوں کہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچئے تاکہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا بلکہ اس کی بجائے ——— مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان

سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے از حد حیرت کا موجب ہوا اور سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہئے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا۔ اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا قریب المحال شے ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہئے چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال

فارسی اور تاریخ ہیں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں:۔

(۱) انگریزی - تاریخ - فارسی

(۲) انگریزی - تاریخ

(۳) انگریزی - فارسی

(۴) تاریخ - فارسی

گویا جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لئے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا:۔

(۵) تاریخ میں فیل

(۶) انگریزی میں فیل

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہوگا۔ لیکن اس میں مصلحت تو ضرور مضمر

ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکہ لگ جائیگا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیتابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار در اصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا۔ بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیئے بی۔ اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لیئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم سے کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انھیں صدمہ نہ ہو لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا کیونکہ تجربے سے اُن پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا لیکن اِدھر اُدھر کے لوگ "ابھی نہیں صاحب" "ابھی کیا کہہ رہے ہو"

"اجی یہ بھی کوئی بات ہے"! ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہر حال ایک پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہئے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں۔ اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال صرف ایک سال اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیجدیں۔ بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اس مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں اُن میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی

کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیوں کہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا لیکن پھر بھی اُن کے دل سے شک رفع نہ ہوا۔ کہنے لگے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔"

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں پھر بھی وہ خموشی طاری رہتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے کھانے کے کمرے میں۔ کامن روم میں، غسل خانوں میں۔ برآمدوں میں۔ ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شکسپیر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ...... والد نے اجازت دے دی

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی اور انھیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا کیوں کہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہاسٹل میں آرہے ہیں۔ جس سے ہم طلبا کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی۔ جس کے ارد گرد ناتجربہ کار طلبا مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے آپ کو مستثنٰی سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہوگئے۔

آل احمد سرور

سرور صاحب بدایوں کے رہنے والے ہیں۔ آگرہ سے بی۔ ایس۔ سی کر کے علی گڑھ آئے اور یہاں سے اُردو و انگریزی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ میں لکچرار ہو گئے سنہ ۱۹۴۶ء میں رضا کالج رامپور میں پرنسپل ہو کر گئے۔ آج کل لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے ریڈر ہیں۔ اُن کے متعدد مضامین رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ سرور صاحب اکثر ریڈیو سے ادبی مضامین براڈکاسٹ کرتے رہتے ہیں۔

آپ کے ریڈیائی مضامین کا مجموعہ "تنقیدی اشارے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مضمون زیر مطالعہ بھی اسی مجموعہ سے لیا گیا ہے سرور صاحب نوجوان ادیبوں میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں تنقید اُن کا خاص موضوع ہے۔ اُردو ادب کے اس باب میں آپ نے معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ آپ کا طرز سادہ اور سلیس ہے اور انداز بیان میں بے حد اعتدال اور توازن ہوتا ہے۔ نثر میں آپ حالی کی پیروی کرتے ہیں۔ انگریزی تنقید سے بھی آپ بڑی حد تک متاثر ہیں۔ اقبال کا مطالعہ آپ نے بڑی دلچسپی سے کیا ہے اور ترجمان حقیقت کے خیالات نے آپ کے خیالات میں گہرائی پیدا کر دی ہے۔ دنیائے ادب کو آپ سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔

اقبال اور اُن کا فلسفہ

اقبال کو ہم سے جدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت گذر گئی۔ اس عرصہ میں اُن کی یاد میں سینکڑوں جلسے کیے گئے۔ ہزاروں تقریریں ہوئیں، نظمیں پڑھی گئیں۔ اخباروں میں مضامین نکلے۔ رسالوں نے خاص نمبر شائع کئے۔ کئی خاص مستقل کتابیں اُن کی شاعری یا پیغام کی تشریح کے لئے لکھی گئیں۔ غرض ملک کے اس سرے سے اس سرے تک ہر ایک نے بہت بڑے شاعر، فلسفی، مصلح، ہمدرد مفکر، حکیم اور انسان کا ماتم کیا۔ موت نے انھیں ہم سے جدا کرنا چاہا مگر وہ مر کر ہم سے اور بھی قریب ہو گئے۔ انھیں حیات ابدی مل گئی۔ اُن کی شخصیت دھندلی ہونے کے بجائے اور واضح، اُن کی شاعری مر جانے کے بجائے اور زندہ ہو گئی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اقبال کی عظمت کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟

ایک عامی سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اقبال بہت بڑے شاعر تھے انھوں نے ترانہ لکھا ہے جسے سن کر ہمارے دلوں میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک بلند پایہ نقاد کہے گا کہ اقبال نے "اردو شاعری کو ایک فلسفیانہ بلند آہنگی" عطا کی ہے، پھر نوجوانوں کے لئے اُن کے یہاں ایک درس عمل، ایک پیغام ملتا ہے۔ ماضی کی یاد اور مستقبل کا تصور

ہے۔ زندگی کا احساس اور عمل کا جوش ہے۔ اقبال خیالات کو بلند، ہمتوں کو مضبوط، نظر کو وسیع کرتا ہے۔ اُس کی شاعری "چیزے دگر" بھی ہے اور "جزویست از پیغمبری" بھی۔ وہ گریۂ ابر بہار، اور "خندۂ تیغ اصیل" دونوں سے کام لیتا ہے۔ حالی اور اکبر دونوں کے سلسلہ کی آخری کڑی اسی پر ختم ہوئی ہے۔

یہ کہنا کہ اقبال بہت بڑا فلسفی ہے، اقبال کی بہت بڑی توہین ہے فلسفی حقیقت کی خشک اور بے جان تفسیریں کرتا ہے۔ وہ کائنات کا ادراک صرف اپنے ذہن سے کرنا چاہتا ہے وہ مادہ اور روح کی بحث میں اُلجھا رہتا ہے، وہ نامی نہیں جامد ہوتا ہے، زندگی کے تمام سرچشموں میں سے صرف عقل سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لئے عقلی استدلال پر جان دیتا ہے۔ وہ شاہین نہیں کرگس ہے۔ شکار زندہ کی لذت اُسے نصیب نہیں وہ الفاظ کے پیچوں میں اُلجھا رہتا ہے۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ بات میں منطقی پہلو سے کہیں کوئی تناقض تو نہیں ہے، اسے کیا معلوم کہ اس تناقض کی رنگینی سے زندگی کی آب و تاب قائم ہے۔ اس لئے اقبال کو ہم ان معنوں میں فلسفی نہیں کہہ سکتے۔ ان کا فلسفہ وہ ہے جو "خونِ جگر سے لکھا جائے"! وہ "مستی احوال" یا "مستی گفتار" کے قائل نہیں۔ "مستی کردار" پر جان دیتے ہیں۔ ان کا اپنا فلسفہ حیات ہے۔ یہ فلسفہ حیات نہ تو فقیر کی جھولی کی طرح ہے۔ جس میں اِدھر اُدھر سے مانگ کر بھیک کے ٹکڑے جمع کر لئے گئے

ہوں۔ نہ یہ خود رو ہے۔ بلکہ اس میں ہمارے تمام سرمایہ ذہنی کی ترقی یافتہ شکل ملتی ہے۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے تمام حکما اور مفکروں کے خیال کے ساتھ پرواز کی ہے ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور نظر نہایت گہری ہے۔ وہ خدا جانے کہاں کہاں سے غواصی کر کے موتی لائے ہیں۔ مگر ان موتیوں کو ایک نئے انداز سے پرو دیا ہے۔ بہت سے خیالات جو پہلے دھندلے اور مبہم طور پر بیان ہوئے تھے۔ اقبال کی فکر روشن کے زیر اثر شعاعیں دینے لگتے ہیں۔ یوں تو اقبال نے مشرق و مغرب کی ساری تہذیبی و تمدنی میراث سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر خاص طور پر وہ رومی نیٹشے اور برگساں سے متاثر ہوئے ہیں ان کے علاوہ دوسرے مفکروں کے خیالات کا عکس بھی ملتا ہے مگر ان تینوں کا اثر زیادہ ہے۔ جمال الدین افغانی مجدد الف ثانی اور بیدل و غالب کا اثر بھی اقبال نے قبول کیا ہے۔

اقبال نے جب آنکھ کھولی تو ایک ایسا ماحول دیکھا۔ جس میں بجائے زندگی کو "ہاں" کہنے کے "نہیں" کہنے پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ ماحول کچھ تو صوفیوں کی تعلیم کا نتیجہ تھا کچھ فلسفہ مسیحیت اور ویدانت کا انسان کی کوئی ہستی نہیں وہ فطرت کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے "عالم تمام حلقہ دام خیال ہے" یہ ساری تعلیم نفی خودی کی تھی۔ "عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" اس لئے آدمی کو چاہئے کہ اپنے آپ

کو جمالِ یار کے مشاہدے میں گم کر دے۔ فرد کی کوئی ہستی نہیں۔ فرد کو چاہیئے کہ اپنی انفرادی اور امتیازی خصوصیات کو مٹا دے۔

اس تعلیم کے نتائج سے اقبال بیزار تھے۔ انھوں نے افلاطون کو گوسفند از گوسفندان قدیم اس وجہ سے کہا کہ یہ سارا فساد اس کی تعلیم کا ہے۔ حافظ کو اس گروہ میں اسی وجہ سے شامل کیا کہ ان کی تعلیم سے بھی نفیِ خودی کی تلقین ہوتی ہے۔ صوفیوں کے خلاف اسی وجہ سے آواز اٹھائی کہ وہ دنیا سے الگ ہو کر "سکینی و محکومی و نومیدی جاوید" کی تعلیم دیتے تھے۔ شعراء کو اس لئے آگاہ کیا کہ اس کی "نوا مردہ و فسردہ و بے ذوق" تھی۔ رومی کی تعریف اس لئے کی کہ وہ بجائے عقل کے عشق پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اثباتِ خودی کا بہت بڑا حامی ہے۔ نٹشے کے قلب کو اسی وجہ سے مومن بتایا کہ وہ تعمیرِ خودی اور استحکامِ خودی کا قائل ہے اقبال نہ صرف نٹشے کا شاگرد ہے نہ صرف رومی کا، وہ نہ صرف مسولینی کا مداح ہے نہ صرف لینن کا۔ وہ جہاں اور جس طرح اپنے نقطۂ نظر کی تائید دیکھتا ہے اس کی تعریف کرتا ہے اور بڑی سے بڑی جگہ پر بھی اگر اسے اپنے پسند کی کوئی چیز نہیں ملتی تو وہاں سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے گرد و پیش جو ماحول دیکھتا ہے اس سے اسے تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے وہ نفیِ خودی کی بجائے اثباتِ خودی کا درس دیتا ہے۔ خودی کو وہ بری صحبت سے نکال کر اسے ایک بلند درجہ عطا کرتا

ہے اور بجائے غرور و خود پسندی کے اس سے احساس نفی یا تعین ذات مراد لیتا ہے۔ انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی زندگی کا شعور ہے۔ اور اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا جائے۔ خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرتا رہے اور فطرت کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کرے اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں تیز ہوتی رہتی ہیں اس کی خودی بڑھتی جاتی ہے اس راہ میں ایک راہ نما کی ضرورت ہے مگر یہ صرف عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہاں عشق سے مدد مل سکتی ہے۔ عشق ہوسناکی نہیں۔ اقبال کے یہاں وہ روحانی کیفیت ہے جو وجدان سے تعلق رکھتی ہے۔ خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہوتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آ جاتی ہیں۔

مگر خودی سے تعمیر و تخریب دونوں کا کام لیا جا سکتا ہے شیطان تخریب خودی کی مثال ہے۔ خودی کی تعمیر کے لئے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کے درجے ہیں، نیابت الٰہی کے درجے تک پہنچنا ہی انسانیت کا نصب العین ہے۔ یہاں تک انسان محض اپنی عقل کے زور سے نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن عشق اُسے یہاں تک لا سکتا ہے۔ مگر وہی عشق جس میں جذبۂ تسخیر جذبۂ تخلیق اور جذبۂ ارتقا تینوں پائے جاتے ہوں۔ جذبۂ تسخیر میں حرکت، عمل اور پیکار کی ضرورت ہے۔۔ اقبال کے فلسفۂ حیات

کی اساس حرکت پر ہے۔ اسے جمود سے نفرت ہے۔ حرکت سے عمل اور پیکار کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اسی لئے سخت کوشش کرنے اور سرگرم رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ شباب اقبال کے نزدیک تن آسانی وتن پروری ہی نہیں اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا دوسرا نام ہے۔ کبوتر پر جھپٹنے میں جو مزا ہے وہ کبوتر کے لہو میں ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے اقبال خونریزی نہیں چاہتے صرف ان مردہ دلوں کو درس زندگی دینا چاہتے ہیں جن کے قوائے عمل شل ہو گئے ہیں۔ انھوں نے جہاں جہاں شاہیں کا ذکر کیا ہے وہاں شاہین کی خونریزی نہیں بلکہ اس کی غیرت" اس کی نظر کی تیزی اس کی بلند پروازی اس کے آشیاں نہ بنانے کی تعریف کی ہے۔ وہ کبوتر کے تن نازک میں شاہین کے جگر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جل ترنگ سے گھبرا چکے ہیں۔ اس لئے کہ فطرت "لہو ترنگ" ہے۔ مگر جنگ یا خونریزی انھیں پسند نہیں۔ وہ اسپارٹا کے سپاہی نہیں چاہتے جو گھر کو بھی میدانِ جنگ سمجھتے ہیں وہ مصارفِ زندگی میں سیرت فولاد اور شبستانِ زندگی میں حریر و پرنیاں پسند کرتے ہیں۔ کوہ و بیابان میں تند رو چشموں کا جوش و خروش اور دامن گلستاں میں دھیمی دھیمی بہنے والی جوئے دل نشیں کا نغمہ انھیں بھاتا ہے۔ حلقہ یاراں میں ریشم کی نرمی اور رزمِ حق و باطل میں فولاد کی سختی انھیں عزیز ہے۔ ان کے مرد مومن کی پہچان یہی ہے کہ جنگ میں وہ شیران غالب سے بڑھ کر ہے اور صلح میں رعنا غزال تاتاری

کے مانند وہ خاکی ہے مگر خاک سے پیوند نہیں رکھتا وہ آفاق میں گم نہیں آفاق اُس میں گم ہے۔ وہ دنیا کے لئے نہیں دُنیا اُس کے لئے ہے۔

مگر فرد کی خودی اقبال کے یہاں مقصود بالذات نہیں ہے اقبال اس خودی سے بے خودی تک پہنچتے ہیں۔ فرد کی صلاحیت اس کی انفرادیت، اس کی امتیازی خصوصیت جماعت کے مفاد کے لئے صرف ہونی چاہئے۔ پرانے شعرا کہتے تھے کہ قطرہ دریا میں ملتا ہے تو اس کی ہستی فنا ہو جاتی ہے۔ اقبال کے خیال میں اس طرح قطرہ کی زندگی کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ جماعت ملت کی صلاحیت کو بہتر بنانا یہ اقبال کا نصب العین ہے۔

دوسرے الفاظ میں اقبال تمام افسانوں کو دعوت عمل دیتے ہیں وہ کسی ایک فرقے یا ملت کے شاعر نہیں۔ تمام انسانیت کے شاعر ہیں۔ وہ فرد کی خودی کی تکمیل اس لئے چاہتے ہیں کہ جماعت کا فائدہ ہو اور بحیثیت مجموعی جماعت ارتقا کے میدان میں آگے قدم بڑھائے۔ انسانیت کی تکمیل کے لئے خودی سب سے ضروری چیز ہے مشرق نے اُسے بھلا دیا اور منفی اثرات میں گرفتار ہو گیا۔ مغرب نے خودی کی تکمیل کی۔ مگر یہ تکمیل قوانین الٰہی کی پابند نہیں تھی۔ اور اس میں وہ روحانی جذبہ نہیں تھا جو اقبال کے نزدیک ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے نظام میں انتشار اور سراسیمگی کے عناصر نمایاں

ہو رہے ہیں۔

انسانیت کی ترقی عین منشائے الٰہی ہے اس منشائے الٰہی تک پہنچنے کے لئے اس روحانی نظام کو اختیار کرنا ضروری ہے جو عین فطرت ہے اس روحانی نظام کی بنیاد توحید پر قائم ہے اور یہی مختلف ملکوں کے رہنے والوں کو ایک رشتہ میں پروتی ہے۔ توحید کے علاوہ اس نظام کی امتیازی خصوصیات اخوت، مساوات، اور وطن و رنگ اور نسل کے محدود تصورات سے بلند ہیں۔ وطن، رنگ اور نسل کے امتیازات، انسانیت کے ارتقا میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ دراصل بے وقت کی چیز ہو گئے ہیں۔ اور ان کی آڑ میں جو ظلم غریبوں اور کمزوروں پر کئے گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ محدود وطنیت اور رنگ و نسل کے فریب کے سب سے اچھے نمونے اس وقت جرمنی اور اٹلی میں ملتے ہیں۔ جہاں تہذیب کی مشعل لے کر دورِ حاضر کے لٹیرے بین الاقوامی قانون کو توڑتے اور بھلے مانسوں کی زندگی کو عذاب بناتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں وطن اور رنگ نسل کے نام پہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اس سے اقبال کے نظریہ کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔

مگر اقبال وطن کے مسائل سے دلچسپی رکھتے اور آزادی پر جان دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ غلامی انسان کی تمام خوبیوں کو مٹا دیتی ہے۔ غلاموں کے لئے زندگی کا وسیع اور تیز دھارا ایک تنگ گندا نالہ بنجاتا ہے۔ دنیا میں صرف مردانِ حُر کی آنکھیں بینا کہی جاسکتی ہیں اور آزادی

سے محروم ہونا گویا انسانیت سے محروم ہونا ہے۔ بالِ جبریل میں ثنائی کے مزار پر نظم اور ضربِ کلیم میں شعاعِ امید پڑھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال کے فلسفۂ حیات میں آزادی کو بنیادی درجہ حاصل ہے اور وہ غلامی پر کسی حال میں راضی نہیں ہیں۔

اقبال تمام انسانوں کی آزادی کے ساتھ ان کی مساوات پر بھی زور دیتے ہیں۔ اس لئے کہ بغیر مساوات کے آزادی بے معنی ہو جاتی ہے وہ ان تمام کوششوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں جو انسانوں کو طبقوں میں بانٹنے کے لئے کی گئی ہیں۔ اور ان کے اثر سے ایک آدمی دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کو دوزخ کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ دولت کی غلط تقسیم دنیا میں بہت سی خرابیوں کی ذمہ دار ہے۔ اقبال جس دنیا کا قیام چاہتے ہیں وہاں دستِ دولت آفریں یعنی مزدور کو محض خیرات نہیں بلکہ اس کا حق ملے گا وہ مزدوروں کو حکومت دینا چاہتے ہیں اور مزدوروں کے دور کے آغاز کا پیغام سناتے ہیں ان کے خدا کا فرمان یہ ہے کہ جس کھیت سے دہقان کو روزی نہ ملے اس کے ہر خوشہ گندم کو جلا دینا چاہیئے۔ وہ لینن کی زبان سے خدا سے پوچھتے ہیں کہ سرمایہ پرستی کا سفینہ کب ڈوبے گا۔ مگر وہ مزدوروں کی حکومت کے نام سے عوام پر استبداد گوارا نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ بہت حد تک روس میں ہوا ہے۔ وہ مزدوروں کو بھی یہ حق نہیں دینا چاہتے کہ وہ ظالم بن جائیں اور اپنے انتقام کی آگ میں ساری دنیا

کو تباہ و برباد کردیں۔ دنیا میں سوشلزم اور فاشزم کی جو کشمکش ہے۔ اقبال اس میں سوشلزم کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کے خیال میں یہ اسلام سے زیادہ قریب ہے ارمغان حجاز میں ابلیس کی مجلس شوریٰ پڑھیے تو اس خیال کی تصدیق ہوجائے گی۔ یہاں وہ مارکس کو کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب کے نام سے یاد کرتے ہیں جو پیغمبر نہیں مگر بغل میں کتاب رکھتا ہے۔

اقبال چونکہ زندگی میں حرکت عمل اور ارتقا چاہتے ہیں۔ اس لئے نفی خودی کے اس درجہ مخالف ہیں کہ اگر انھیں اثبات خودی میں کہیں غلو بھی ملتا ہے تو وہ اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ ان کی مختلف نظموں میں ابلیس کی جرأت و ہمت اس کے استقلال اس کی دلچسپ شخصیت کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ تعریف کچھ اس انداز میں ہے جو ملٹن نے "فردوس گم شدہ" میں استعمال کیا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے اقبال نیٹشے کی تعریف کرتے ہیں جو ارتقائے حیات، علو آدم اور تسخیر فطرت کا حامی اور مسیحی تعلیم کے منفی اثرات کا شدت سے منکر ہے اقبال اسے مجنوں کے بجائے مجذوب کہتے ہیں اور اس کے قلب کو مومن اور دماغ کو کافر بتاتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں یہ کفر اس ایمان سے بہتر ہے جس کا اثر سکوت جمود اور موت ہو' اس لئے کہ اس میں جذبۂ زندگی ہو جو دے جو ممکن ہے آگے چل کر حرارت ایمانی سے مشتعل ہوجائے۔ غرض اقبال کا فلسفۂ زندگی بلند ترین مقاصد کی

ترجمانی کرتا ہے۔ وہ زندگی کو فطرت کا منشا و مقصد سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے انھیں یقین ہے کہ زندگی موت کے ہاتھوں پامال نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ "والدہ مرحومہ" کی یاد میں انھوں نے اپنے فلسفۂ موت کو بڑے دلکش انداز سے پیش کیا ہے اور ان کی نظم اسی وجہ سے انگریزی کے مشہور مرثیوں کے پایہ کی ہو گئی ہے۔ ان کے خیال میں موت کے ذریعہ سے فطرت زندگی کے مذاق کی تجدید کرتی ہے۔ وہ شہید آرزو ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ اس دعوے کو انھوں نے موج مضطر، تخم گل اور ستاروں کی مثالیں دے کر ثابت کیا ہے۔ اس نظم میں تخیل کی بلندی، خیالات کی پختگی اور انداز بیان کی دلآویزی اس طرح مل گئی ہیں کہ نظم خاصے کی چیز ہو گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس مختصر سی گفتگو میں شاید اقبال کے فلسفۂ حیات کے بنیادی پہلو آپ کے سامنے آ گئے ہوں گے۔ دنیا میں کم شاعر ایسے ہوں گے جو ایک ہی بات کو یا اس کے مختلف پہلوؤں کو الٹ پھیر کر اس قدر خوبی سے بیان کر سکے ہوں۔ باوجود اس کے کہ اقبال کے یہاں حیرت انگیز تنوع ہے۔ ان کے یہاں حیرت انگیز وحدت بھی ہے۔ ان کا ایک مکمل فلسفۂ حیات، ایک آہنگ اور ایک پیغام ہے۔ اس فلسفۂ حیات کے لئے وہ دوسروں کے ممنون بھی ہیں۔ مگر کسی کے مقلد نہیں وہ بہت بڑے خلاق، بہت بڑے معلم، بہت بڑے مفکر اور مجدد ہیں انھوں نے کیا فضا پائی اور کیا چھوڑی اس پر غور کیجئے تو ان کی

شاعری" کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے مگر اسی آپ درنگ شاعری کی وجہ سے ان کا فلسفۂ حیات اس قدر حسین معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اقبال کا ایک بھی شعر ابھی تک نہیں پڑھا۔ لیکن اب ان کے چند شعر اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کر کے آپ سے رخصت ہوتا ہوں ؎

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
قدرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی — خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش — خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش — میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پر سوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

105